افسانوی مجموعہ

مُٹھی بھر چھاؤں

پرویز مانوس

درخشاں پبلی کیشنز 115 آزاد بستی ویسٹ نٹی پورہ سرینگر

کسی فنکار کے سامنے جو کائنات موجود ہوتی ہے، وہ نامکمل اور نقائص سے پُر ہوتی ہے۔ فنکار ان نقائص کو دُور کر کے کائنات کو تکمیل کی صورت عطا کرتا ہے، وہ کائنات کے ساز کو حیات کے سوز سے مخمور کر دیتا ہے یہ کارنامہ وہ فکری، فنی اور تخلیلی عناصر کے امتزاج سے انجام دیتا ہے، فنکار میں یہ قوت وصلاحیت اپنے گرد وپیش کے احوال وآثار پر شدید گرفت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔

پرویز مانوس بھی اپنے افسانوں کے لئے مواد قرب وپاس سے ہی حاصل کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے واقعات وواردات سے اپنی کہانیوں کے تانے بانے تیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں کہانی پن کا بھی خاص انداز رکھتے ہیں، جو نہات ہی دلچسپ ہوتا ہے ان کے افسانوں میں نہ بے جا علامتیں ہیں نہ کوئی الجھاؤ کہ جنہیں سمجھنے کے لئے قاری کو اپنا سَر دُکھانا پڑے بلکہ یہ افسانے مختصر اور صاف سُتھری زبان میں ہیں جو سیدھا دل پر اثر کرتے ہیں۔ مانوس کا فنی برتاؤ افسانوی رنگ وآہنگ سے ہم آمیز ہو کر منفرد ہو جاتا ہے اور گہرا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہے۔ ''مٹھی بھر چھاؤں'' کا ہر افسانہ کسی نہ کسی مرکزی موضوع سے متعلق کتنے ہی ذیلی مسائل وسلگتے ہوئے سوالات کا احاطہ کرتا ہے اس طرح مانوس کی فنکاری یا ان کے قلم کی پختہ کاری کئی جہتوں سے متاثر کرتی ہے۔ افسانے کی یافت ہو یا ماجرا طرازی ہو۔ کردار سازی ہو یا مکالمہ نگاری۔ تجسّس وتحیر کے عناصر ہوں یا قصّے کی ارتقائی سمت ورفتار کی تاثر خیزی۔ وہ ہر مرحلے میں اپنی فنی چابکدستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

کوثر صدیقی
مدیر ''ادبی اُفق''
کراچی پاکستان

اپنے مخلص اور بے باک
تنقید نگار دوست سلیم سالک
کو محبتوں کے ساتھ

9419463482

افسانوی مجموعہ

مُٹھی بھر چھاؤں

پرویز مانوس

درخشاں پبلی کیشنز، ۱۱۵۔ آزاد بستی ویسٹ، نٹی پورہ، سرینگر

کتاب	ــــــــــ	مُٹھی بھر چھاؤں
مُصنف	ــــــــــ	پرویز مانوسؔ
تعداد	ــــــــــ	۵۰۰ جلد
صفحات	ــــــــــ	۱۹۳
قیمت	ــــــــــ	۳۰۰ روپے عام ایڈیشن
لائبریری ایڈیشن	ــــــــــ	۵۰۰ روپے
اشاعت	ــــــــــ	۲۰۱۵ء
کمپوزنگ	ــــــــــ	فیروز احمد کمار، تھری ڈی ڈیزائننگ، سینٹرل مارکیٹ آبی گذر، لالچوک سرینگر
سرورق	ــــــــــ	فردوس احمد
طباعت	ــــــــــ	جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی

نوٹ:۔ اس کتاب کی اشاعت میں جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کا جزوی مالی تعاون بھی شامل رہا ہے۔ جس کے لئے مصنف اکیڈیمی کا شکرگزار ہے۔

انتساب

اپنے پھوپھا جان (والدِ نسبتی)

الحاج غلام محمد ڈار

کے نام

زندگی کی تپتی راہوں پر جن کا دستِ شفقت
ہمیشہ میرے سر پر رہا

اس کتاب میں شامل تمام افسانوں کے نام، کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ لہٰذا کسی بھی نام، کردار یا واقعات کی مناسبت محض اتفاق تصور کیا جا سکتا ہے جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

فہرست

ابتدایہ

مُٹھی بھر چھاؤں...... پرویز مانوس کے انیس افسانوں پر مشتمل مجموعے کا نام ہے۔ یہ نام...... مٹھی بھر چھاؤں یوں تو بغیر کسی آہٹ کے میرے ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہو گیا لیکن فوراً ہی مجھے احساس ہوا اور مجھے لگا جیسے میں، میرا وطن، میرا کشمیر ہم سب درد و کرب، غم و اذیت اور ہجر و وصال کے طویل لمحوں کی دھوپ میں جل جل کر مٹھی بھر چھاؤں کی تلاش میں آسمان کی جانب نظریں اٹھائے سرگرداں ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب میرا وطن میرا کشمیر شاداب تھا، سرسبز تھا اور امن وآشتی کا گہوارہ تھا۔ اپنی بھرپور زندگی جی رہا تھا۔ نئے ولولوں کے ساتھ بھرپور رعنائیوں کے ساتھ نئی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ، دھوپ بھی تھی پیاری پیاری، میٹھی میٹھی سی، چھاؤں بھی تھی۔ مٹھاس اور مقامی رنگ

و بو سے لبریز، رنگوں میں ڈوبی ہوئی......اور پھر ایک ایسا لمحہ آیا کہ زندہ اور متحرک مخلوق بے بس نظر آنے لگی بے حرکت ہوگئی، سہم اور ڈر گئی لیکن قلم کی حرکت، قلم کی قوت لفظوں کے سہارے درِ زندان پر دستک رہتی رہی یہاں کے قلم کار احتجاج رقم کرنے لگے...... مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ ان قلم کاروں میں پرویز مانوس بھی شامل ہیں جن کی نثری اور شعری تخلیقات میں زندگی کی تلخی، محرومی، لاچاری کے ساتھ ساتھ زندگی کی عظمت احساس کی شدت اور حالات واقعات کی منظر کشی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

پرویز مانوس کا بچپن ریاست کے سرسبز اور شاداب علاقہ پونچھ میں گزرا اب وہ مستقل طور پر شہر سرینگر میں قیام پزیر ہیں لیکن پونچھ کی ادبی ذرخیزی، شادابی اور رعنائی آج بھی ان کی تحریروں کی آبیاری کر رہی ہے۔ ادبی اور علمی تعلق سے پرویز مانوس بڑی خوبیوں کے مالک ہیں بنیادی طور پر کشمیری نہ ہونے کے باوجود وہ کشمیری زبان وادب میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور بڑی روانی کے ساتھ کشمیری بولتے ہیں، وہ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں اور مترجم بھی، افسانے اردو میں لکھتے ہیں اور پہاڑی میں بھی، شاعری بھی ان دونوں زبانوں میں کرتے ہیں سن ۲۰۰۹ اور سن ۲۰۱۰ میں سانجھا درد اور ''سانجھی سوچ'' کے عنوان سے

ان کی دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان دونوں کتابوں میں کشمیری زبان کے منتخب افسانہ نگاروں کی افسانوی تخلیقات کو پرویز مانوس نے پہاڑی زبان کا روپ دیا ہے۔ انہوں نے خواجہ فاروق رینزو کے کشمیری زبان میں تحریر کردہ ناول ''آپ چھُو ذران'' کو پہاڑی زبان میں منتقل کر کے کشمیری اور پہاڑی زبانوں کے درمیان ایک راہ ہموار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی سوانح عمری Wings of fire کو پہاڑی زبان میں ترجمہ کر کے ایک ہور ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ان کے تین شعری مجموعے بیتے لمحوں کی سوغاتیں ۱۹۹۲ء موسم اڑان کا ۱۹۹۷ء چاند لمس گلاب ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئے۔ یہ تینوں تخلیقات شاعرانہ زبان اور اظہار اسلوب کے تعلق سے ان کی شاعرانہ حیثیت کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ ان کی شاعری فکر مند سوچوں کی پیداوار ہے۔ ''چن ماما'' کے نام سے انہوں نے بچّوں کے لئے کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کتاب کو سن ۲۰۰۶ء میں ریاستی سطح پر کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے انعام سے نوازا گیا ہے اور ۲۰۱۱ء میں سانجھا درد کتاب کو بہترین ترجمے کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پرویز مانوسؔ نے اگر چہ اپنی افسانہ نگاری کی شروعات سن

۱۹۸۵ء میں کی لیکن ان کا پہلا افسانہ ''احساس'' سن ۱۹۸۹ء میں روزنامہ ہند سماچار میں شائع ہوا۔ اس افسانے کی اشاعت کے ساتھ ریاست کے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہوگئے۔ افسانوی دنیا میں یہ ان کی پہلی کامیابی تھی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت'' سن ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ ایک کامیاب شاعر اور مترجم ہونے کے باوجود افسانوی ادب سے ان کی دلچسپی اور وابستگی قائم ودائم ہے، وہ برابر ۱۹۸۹ء سے افسانے لکھ رہے ہیں، ریاست اور بیرون ریاست کے موقر جرائد میں یہ افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تخلیقات ریاست کے معروف روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں بھی کے ادبی صفحات کی زینت بننے کی وجہ سے اب تو ریاست کے اور دراز علاقوں میں بھی ان کے قارئین پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں ان کی بھی بات کرتے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ کی بات، ان کے مختلف سماجی اور اقتصادی مسائل کی بات...... وہ ان کی حالت زار کی نوحہ خوانی بھی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے قارئین ان کی تخلیقات کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔

مٹھی بھر چھاؤں...... اس عنوان میں رنگارنگی اور معنویت نظر آتی ہے۔ نازک احساس کی لہک محسوس ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں

شامل افسانے پڑھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ پرویز مانوس کا افسانے لکھنے کا اپنا ایک انداز ہے۔ ان کے افسانے تجربات اور احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں زبان و بیاں کی نزاکتیں ملتی ہیں انسان دوستی کی فضا ملتی ہے۔ خواتین کی بیچارگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ بھوک افلاس اور ناداری کی ان گنت تصویریں کینواس پر لکھی جاتی ہیں۔ اونچے ایوانوں میں ہو رہی بداعمالیوں کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ سرمایہ دار اور سیاست دانوں کے چہروں کی نقاب کشائی کر کے ان کو عوامی عدالت میں پیش کرنے سے ہرگز ہرگز نہیں ڈرتے۔ آج کے اونچے اور بڑے لوگوں کے قول و فعل اور کردار کی صیح عکاسی کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ مٹھی بھر چھاؤں میں شامل اکثر افسانوں میں کشمیر کی دھواں دھواں فضائیں ملتی ہیں، ٹوٹے ٹوٹے مناظر ملتے ہیں۔ تبدیل ہوتی ہوئی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔

افسانہ قدرت کے پس منظر میں آج کے سائنسی اور مشینی دور کی فضا نظر آتی ہے۔ زندگی کی حقیقی جھلک ملتی ہے۔ یہ تو آج کے دور کی ایک عام بات ہے...... ماں باپ بیٹا بہو...... لڑکا یا لڑکی کی پیدائش...... ماں اور بیٹے کی لڑکی کی پیدائش میں غیر دلچسپی...... اماں کی بے چینی بے قراری

اور محبت...... جب ایک حادثہ میں باپ بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ بیٹی کی پیدائش میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جاتا ہے، یوں تو یہ کہانی یہاں پر بھی اختتام پذیر ہو سکتی تھی اور پڑھنے والا بھی مطمئن ہو جاتا لیکن پرویز مانوس نے ایسا نہیں کیا ہے۔ انہوں نے ایک نیا موڑ دے کر کہانی کو اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ آپ کہانی پڑھیے کہانی کے کلائمکس سے آپ چونک پڑیں گے۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد افسانہ نگار کے پر معنیٰ انداز تحریر متاثر کرتی ہے۔

آج کے دور میں انسانی زندگی کی کیا اہمیت ہے ایک انسان کو دوسرے انسان سے کس قدر ہمدردی ہے اور اس کے برعکس پرندے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کس قدر حصہ لیتے ہیں، اس کی ایک عمدہ مثال کہانی ''درد کی دہلیز'' میں ملتی ہے یہ دیکھئے......

کوؤں کا شور تو وہ پہلے بھی سنا کرتا تھا لیکن اس شور میں عجیب سا درد تھا۔ ایک تڑپ تھی، کسک تھی، اتنے سارے کوؤں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا آخر ماجرا کیا ہے؟''

زندگی میں بچوں کی اہمیت زیادہ ہے یا دوست کی...... یہ ایک دلچسپ موضوع ہے اور اس موضوع کو پرویز مانوس نے اپنی کہانی ''برگشتگی'' میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس کہانی کا مرکزی

کردار مہر اسرأ احساسات اور جذبات کی مخصوص چھاپ لئے ہوئے نظر آتی ہیں۔

کہانی ''گھونسلے'' کا پس منظر ہجرت کے ارد گرد گھومتا ہے انسانی پیکر کو چڑیوں کا روپ دے کر کشمیر سے جانے والوں کی تصویر کشی ایک نئے انداز سے کی گئی ہے۔ یہاں کھلے پن کی بجائے اشاروں اور تشبیہات کا سہارا لیا گیا ہے اور ایک اہم موضوع کو افسانوی رنگ دے کر پیش کیا ہے۔

کشمیر کے ہندو مسلم بھائی چارہ کی ایک سندر سندر سی تصویر افسانہ فساد میں ملتی ہے۔ یہ بھائی چارہ ریاست جموں و کشمیر کے تمدن اور ورثے کا ایک اہم حصہ رہا ہے اور یہ ہماری تاریخ کے اوراق کو ہمیشہ مالا مال کرتا رہے گا۔

افسانہ ''آس بھرے دو نیناں'' سے ایک جُملہ...... ''نہیں نہیں یہ تصویر تو میرے جینے کا سہارا ہے۔ میری تنہائی کا ساتھی......لیکن ایسا نہ ہو وہ بادام جیسی آنکھیں میرے انتظار میں پتھرا کر اپنی بے پناہ محبت کا احساس دلا جائیں اور میں کہیں کا نہ رہوں......محبت کی گرمی سے بھرپور یہ کہانی کردار نگاری کے تعلق سے ایک اچھی کوشش ہے۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ مٹھی بھر چھاؤں میں مختلف نوعیت اور

مختلف موضوعات پر لکھے گئے افسانے شامل کے گئے ہیں میں نے اپنی اس مختصر بات میں صرف چند ایک افسانوں کی ہی بات کی ہے۔ لیکن بڑی بات تو یہ ہے کہ پرویز مانوس نے ان موضوعات کو اپنے انداز سے قلم بند کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ انداز یہ لب ولہجہ پڑھنے والوں کو پسند آئے گا۔ افسانوں کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ ان میں کہیں کہیں طنز کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کرداروں میں عزمِ زندگی اور زندگی جینے کے خوابوں کی تعبیر ملتی ہے۔ وہ اپنے خوابوں کی تلاش میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں اور اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے انہیں تلاش ہے۔ مٹھی بھر چھاؤں'' کی......!!!

نور شاہ

راولپورہ سرینگر

...........☆☆☆...........

پرویز مانوسؔ "مُٹھی بھر چھاؤں" کے تناظر میں

پرویز مانوسؔ کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کی اس نئی اور حساس نسل سے ہے جس نے بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے دوران جموں اور بالخصوص کشمیر میں پیدا شدہ بحرانی حالات وواقعات کو نہ صرف دیکھا بلکہ خود بھی ان حالات کا عطا کردہ درد وکرب جھیلا اور شدت سے اُسے محسوس کیا۔ چنانچہ ۱۹۸۹ء سے لے کر ۲۰۱۰ء تک کے عرصے میں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں ہمیں انسانی اقدار کی شکست وریخت، قتل وغارت کی وارداتیں، سیاسی اُتھل پتھل، نقلِ مکانی، تلاشِ سکون، علحیدٗگی پسند تنظیمیں، عوام اور فوجیوں کے درمیان تصادم، ایک عام اور بے بس آدمی کی آہیں اور سسکیاں، مکارانہ ذہنیت اور منافقانہ چالیں، کشمیری پنڈتوں کا اپنے مادرِ وطن سے نکل کر جموں اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں بسنا، سیاسی بازی گری، احساس تنہائی، خوف وہراس اور بے اطمینانی

کے علاوہ بندوق کلچر پڑھنے کو ملتا ہے۔ پرویز مانوسؔ کے افسانوں میں کشمیر کے پُرآشوب حالات اور وہاں کے عوام کا دُکھ درد ہمیں یاس وحسرت اور رنج وغم میں مبتلا کر دیتا ہے۔

''مٹھی بھر چھاؤں'' پرویز مانوس کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ۱۹۹۵ء میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت'' شائع ہوا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں کُل ۱۹ افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا نام ''مٹھی بھر چھاؤں'' تجویز کیا گیا ہے۔ گویا اب آج کا انسان اپنے اعمالِ بد کے باعث مٹھی بھر چھاؤں کے لئے ترس رہا ہے۔ اُسے زندگی کی ننگی دھوپ نے جھلسا کے رکھ دیا ہے۔ وہ امن وسکون کی تلاش میں ہے۔ حیرت کا ٹھاٹھیں مارتا دریا اُس کے ذہن ودل میں موجزن ہے۔ آئے دن کی ہڑتالوں، کان کے پردے پھاڑ دینے والے نعروں اور خون اگلتی تقریروں سے اب وہ تنگ آچکا ہے۔ لہٰذا اُسے اب یک گونہ سکون چاہیئے اور وہ امن وخوشحالی کی لہلہاتی ہوئی کھیتی دیکھنے کا متمنی ہے۔ پرویز مانوسؔ کے متذکرہ افسانوں کا مرکزی نقطۂ نظر یہی ہے۔

افسانہ ''درد کی دہلیز'' میں بے درد معاشرے کی بے مروتی اور خود غرضی کی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ایسا بوڑھا آدمی ہے جو اپنی بیماری سے نجات پانے کی خاطر در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد مایوس ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر افسانے کے اختتامی حصے میں ایک کوّے کی موت پہ تمام کوّوں کا اکٹھا ہو کر شور وغل کرنا دراصل ماتمِ

انسانیت کا علامیہ ہے۔

افسانہ قدرت میں بیگم عثمانی یہ نہیں چاہتی کہ اُس کی بہو بچّی کو جنم دے۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے عدنان کے ساتھ نوشی کو ابورشن کروانے لے جاتی ہے اور ایسا نہ کروانے پر وہ اپنے بیٹے کو یہ مشورہ تک دیتی ہے کہ وہ بہو کو طلاق دے مگر ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہوئے سڑک پہ جلد بازی کی وجہ سے عدنان کی گاڑی ایک ٹرک سے جاٹکراتی ہے اور بیگم عثمانی جائے حادثہ پر ہی دم توڑ دیتی ہے جبکہ عدنان اور اُس کی بیوی نوشی کو معمولی چوٹیں آتی ہیں۔ مگر اس حادثے میں نوشی کا حمل ضائع ہوجاتا ہے جو انتہائی افسوس ناک بات ہے۔

افسانہ ''سفید خون'' پرویز مانوس کا ایک لرزہ خیز افسانہ ہے جس میں انہوں نے فنی چابک دستی سے مقدس رشتوں کی پامالی کو بیان کیا ہے۔ دینا ناتھ کے درندہ صفت بیٹے محض لالچ اور شک کی بنیاد پہ اپنے باپ کا گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔ دینا ناتھ کی بہوئیں جائیداد کا بٹوارہ چاہتی ہیں۔ اس لئے وہ دینا ناتھ کو مارنے کی تحریک دیتی ہیں۔ بیٹے اپنے باپ کی الماری سے سونے کی اینٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہاں ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں ہوتی ہے۔ جب دینا ناتھ کو مارنے کے بعد اُس کے پتھر دل بیٹے الماری کھولتے ہیں تو اُنہیں وہاں اپنی مری ہوئی سوتیلی ماں کی تصویر کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مذکورہ افسانے کا اختتام قاری کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ پرویز مانوس نے دینا ناتھ کے بیٹوں کے ہاتھوں اُس

کے قتل کی واردات ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کی ہے جو ایک حساس قاری کے دل میں رنج وغم کی ایک گونج سی پیدا کر دیتی ہے۔

''بشن نے دروازے پر دستک دی تو دستک سُن کر دینا ناتھ کی آنکھ کھل گئی۔

وہ ہڑبڑاہٹ میں اندر سے پوچھ بیٹھا'' کون ہے آدھی رات کو''؟

ہم میں پتا جی! بشن اور کِشن

''کیا بات ہے خیریت تو ہے''؟ بشن گبھرایا ہوا بولا پتا جی نیلم بھابھی دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے۔ دائی ماں کے پاس چلنا ہے۔ ذرا جلدی کیجئے''۔

دینا ناتھ اندھیرے میں ہی آہستہ آہستہ دروازے تک پہنچا اور چٹخنی کھول دی۔ دروازے کے کواڑ کھلتے ہیں دونوں بیٹے اُس پر جھپٹ پڑے۔ وہ بے چارہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ کشن نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دینا ناتھ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بشن نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبائے رکھا۔ دینا ناتھ نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر اپنے ہی خون کے آگے اُس کی ایک نہ چلی۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد دینا ناتھ کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور پھر اُس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا''۔

شک حرص وہوس اور دولت کا نشہ کس حد تک انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ پرویز مانوسؔ نے بڑے موثر انداز میں اس المیے کو کہانی کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ عصری سماج میں ایسے المناک واقعات اخباروں کی

سُرخیاں بنتے رہتے ہیں۔

''خراشیں'' میں معصوم حسرتوں اور ناممکنات کو ممکنات میں بدلنے کی ایک لاحاصل کاوش کا ذکر ہے۔ پری جو چاند کو حاصل کرنے کی تمنا میں دیوداروں کی شاخوں سے سوائے خراشوں کے اور کچھ حاصل نہیں کرتی ہے۔ اصل میں یہ کہانی بہت حد تک علامتی انداز میں ایک دکھ درد ہی کا اظہار ہے کہ کچھ لوگ دنیا میں اپنے ارمانوں کی تکمیل میں تمام حربے استعمال کرنے کے باوجود محروم رہتے ہیں۔

''برگشتگی'' بھی ایک اچھی کہانی ہے۔ اس کہانی میں پرویز مانوسؔ نے عصری معاشرے میں والدین کی گوناگوں مصروفیات کے باعث اپنی اولاد سے پیار ومحبت کی باتیں نہ کرنے یا اُن کے احساسات کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں جس زلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ قابلِ توجہ اور لمحۂ فکریہ سے تعلق رکھتا ہے۔ سیٹھ کریم خان کی بیٹی بچپن ہی سے باپ کے پیار سے محروم رہتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی اپنی مرضی سے اپنا شریکِ زندگی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ وہ برات والے دن اپنے من پسند عاشق عامر کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ کہانی میں پرویز کا ناصحانہ انداز آج کل کے والدین کے لئے ایک خاص پیغام ہے۔

کہانی ''گھونسلے'' ایک علامتی کہانی ہے، جس میں کشمیر میں پھیلی دہشت گردی اور اُس کے نتیجے میں عام بے قصور لوگوں کی زندگی کا درد وکرب موجود ہے۔ پرویز مانوسؔ نے زیرِ نظر کہانی میں چڑیوں، گھریلو اور

جنگلی بلیوں کا ذکر جس بیانیہ انداز میں کیا ہے وہ غور وتدبیر کی راہیں کھولتا ہے۔ کمزور پہ طاقتور اپنا تسلّط نہ جمانے پائے اس کے لئے ایک حساس اور مضطرب دل رکھنے والے کا کردار بھی صغیہٗ واحد متکلم میں سامنے آتا ہے۔ جو تحفظ کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

افسانہ ''فساد'' اپنے موضوع اور فنی لوازمات کے لحاظ سے ایک جاندار افسانہ ہے۔ اس افسانے میں شکیلا اور شانتی دونوں عورتوں کی لڑائی اور پھر دونوں اپنے اپنے شوہروں کو اس میں شامل کرنا چاہتی ہیں لیکن دلاور اور سریندر کسی حد تک دور اندیشی اور تحمل مزاجی سے کام لیتے ہیں۔ دو عورتوں کی لڑائی سے پوری کالونی میں رہنے والے لوگ تنگ آجاتے ہیں۔ اسی دورانیہ میں سیاسی بازی گری کے باعث ہندو مسلم منافرت کی مسموم آندھی چلنا شروع ہو جاتی ہے جس کے باعث قتل وخون اور بے گھر ہونے والے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کہانی کا اختتام کہانی کار نے انسانی ہمدردی، بھائی چارے اور دلوں کی کدورتوں کے خاتمے پر کیا ہے۔ دلاور اور اُس کے افرادِ خانہ جہاں اپنی جان بچانے کے لئے بڑے چوکنے طور پر اوزار اور ہتھیار لے کر تیار بیٹھے تھے وہیں دوسری طرف سریندر، شانتی اور اس بچّے دلاور کے گھر والوں کے لئے کھانا اور برتن لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ قاری یہاں ایک خاص قسم کا اخلاقی درس حاصل کرتا ہے۔ سیاست کس طرح لوگوں کو فرقہ وارانہ فساد پر آمادہ کرتی ہے۔ اس سے متعلق مذکورہ افسانے سے ماخوذ یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

اسی اثنا میں وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ سیاست کی لو سے شہر کا سارا ماحول کچھ زیادہ ہی گرم ہو گیا۔ دھرتی پر تعصب کے بیج پھوٹنے لگے۔ شیریں دہن مکھڑوں سے نفرت کا زہر بہنے لگا۔ گاندھی ٹوپی والوں نے اس موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس تندور پر ووٹوں کی روٹیاں سینکنا شروع کر دیں۔ دونوں فرقوں کے لیڈروں نے اپنی اپنی تقاریر سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ سیدھے سادے لوگ اُن کے ہاتھوں کے کھلونے بن گئے۔ شہر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے دیکھتے دیکھتے شہر میں سوڈا واٹر کی بوتلوں اور پتھروں کی بارش شروع ہو ہی گئی...... لاٹھیاں، کُھلاڑیاں، ترشول، نیزے اور برچھیاں ہر قسم کے ہتھیار مارکیٹ میں آ گئے۔ چند سر پھرے لوگوں نے صدیوں کے بھائی چارے کی چادر کو تار تار کر دیا۔ لوٹ مار کے بعد ذاتی دشمنی نکالنے کی غرض سے کئی دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ آگ کی لپٹیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ نفرت کے دھوئیں سے محبت کا آسمان سیاہ ہو گیا تھا''۔

افسانہ ''امّی گھر چلونا'' میں زرینہ جیسی خوب صورت عورت کی بے بسی کو پرویز مانوس نے بڑے فنکارانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری آخر پر چونک اٹھتا ہے۔ زرینہ کا ناصر کو اپنا شریکِ زندگی بنانے کا ایک جرأت مندانہ قدم پوری خاندانی روایات کو توڑنے سے تعلق رکھتا

ہے۔ اس افسانے میں زمیندار اور وکیل کا جو کردار پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے معاشرے کے لئے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل آج کل کے دور میں وکالت جھوٹ بولنے کا ایک آرٹ بن چکا ہے۔ وکیل اپنے موکلوں کو فوری طور پر انصاف اس لئے نہیں دلاتے کہ اس صورت میں اُن کی آمدنی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ زرینہ کے شوہر، ناصر کو ایک خاص سازش کے تحت گرفتار کروایا جاتا ہے اور زرینہ اپنے بچّے کاشف کو گود میں اٹھائے عدالت کے چکر کاٹتی رہتی ہے۔ بالآخر ناصر کو عدالت جیل بھیج دیتی ہے۔ زرینہ کا وکیل اُس کے خوب صورت جسم کو نچوڑنا چاہتا ہے مگر زرینہ ایک پاک دامن اور غیرت مند خاتون ہونے کی حیثیت سے وکیل کا قتل کر دیتی ہے اور وہ بھی اپنے ننھے بچّے کاشف کے ساتھ جیل چلی جاتی ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ منظم اور مربوط ہے۔ کردار جیتے جاگتے اور اندازِ پیش کش دلچسپ ہے۔

''افسانہ'' وہ ایک سجدہ'' میں منظر نگاری کا عُنصر موجود ہے۔ اس افسانے کو پڑھ کر کشمیر کے صحت افزا مقامات کے دلکش مناظر آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔ خان بابا اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ یوں تو سماج میں ڈھونگی باباؤں کی کمی نہیں کہ جو عام سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کر کے لوٹتے ہیں لیکن خان بابا تو کچھ چمتکاری بابا معلوم ہوتے ہیں جو بہت حد تک توحید پرست بھی ہیں اور جب وہ ایک سنگتراش کی مورتی سے باتیں کرواتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے اس افسانے میں دراصل افسانہ نگار کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ

جب انسان اللہ کے عشق میں متغرق ہو جاتا ہے تو پھر کوئی بھی بات نا ممکنات میں نہیں رہتی''۔

''آخری چنار'' اگر چہ علامتی انداز کا افسانہ ہے مگر اس میں کشمیر میں آئے دن کی ہڑتالیں، جلوس اور ہنگامہ آرائیوں کے زیر اثر ایک عام شہری کی بے بسی اور محکومیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نور محمد اور اس کی اہلیہ زیبا کے پانچ چنار کے پودے جنہیں نصب کرنے کے بعد ان کے نام انھوں نے بلال، شبیر، فاروق، شہباز اور شاداب رکھے تھے۔ تناور درخت ہونے کے بعد پرندوں، جانوروں اور انسانوں کی راحت و آرام کا باعث بنتے ہیں مگر جب بحرانی حالات رونما ہوتے ہیں تو یہ پانچوں چنار یکے بعد دیگرے ان حالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ چنار اصل میں نور محمد اور زیبا کے پانچ بیٹے بھی ہو سکتے ہیں جو ملی ٹینٹوں یا پھر فوجیوں کی گولی کا نشانہ بنے ہوں گے۔

افسانہ ''محبت ایسی دھڑکن ہے'' میں دو دوستوں خالد اور طاہر کی دوستی میں شگفتہ نام کی ایک حسین و جمیل لڑکی حائل ہو جاتی ہے۔ خالد امیر گھرانے کا چشمِ و چراغ ہے۔ جبکہ طاہر ایک یتیم لڑکا ہے جو بعد میں خالد کی بھرپور مالی معاونت سے پولیس آفیسر بن جاتا ہے۔ خالد اور طاہر دونوں شگفتہ کو چاہتے ہیں بالآخر محبت ایک بھیانک رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ ایک رات طاہر، خالد کو گولی مار کر ہلاک کر دیتا ہے اور محبت کی یہ کہانی اس طور اختتام کو پہنچتی ہے۔

''چوڑیاں'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں راحیل اُس کی ماں اور راحیل کی بہنوں کے سپنوں کو حالات کے جبر میں پورا نہ ہوتے دکھایا گیا ہے۔ قاری کے ذہن پہ اس افسانے کا مجموعی تاثر یہ مرتسم ہوتا ہے کہ انسان کیا چاہتا یا سوچتا ہے اور قدرت کو کیا منظور ہوتا ہے۔ راحیل کی بہنیں اس سے چوڑیاں طلب کرتی ہیں اور راحیل ایم بی بی ایس کا ٹیسٹ دے کر واپس گھر نہیں آتا بلکہ وہ ایک گاڑی سے ٹکرا کر اپنا ذہنی توازن کھو دیتا ہے۔

افسانہ ''محسن'' میں رحمت خان کی عیاشی اور اس کی بیوی افشاں کے مایوس کن حالات کو عیاں کیا گیا ہے۔ رحمت خان، حُسن بانو جیسی مشہور طوائف کی اداؤں پر مر مٹنے والا ایک مالدار آدمی ہے مگر طوائف بازی میں اپنا تمام مال واسباب لٹا دیتا ہے وہ اپنی بیوی بچے کا خیال نہیں رکھتا ہے بالآخر حسن بانو رحمت خان کو کوٹھی اور بقیہ جائیداد شراب پلا کر اس کی بیوی افشاں کے نام لکھوا لیتی ہے۔ اس طرح ایک طوائف، افشاں جیسی بے بس عورت کی مدد کرتی ہے۔

پرویز مانوسؔ کے تازہ افسانوی مجموعہ ''مٹھی بھر چھاؤں'' میں شامل افسانے عصری معاشرے میں پیدا شدہ نا آسودگیوں، ناہمواریوں، ذہنی کوفتوں اور زندگی کے منفی رویوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام کہانیوں میں بیان اور بیانیہ کی آمیزش موجود ہے۔ زبان سیدھی سادی، عام فہم اور دلچسپ ہے۔ پلاٹ سازی، کردار نگاری، منظر کشی، کہانی کا آغاز وانجام اور وحدتِ تاثر جسے میں کہانی کی جان سمجھتا ہوں تقریباً ان تمام فنی لوازمات کی

جانکاری اور انہیں برتنے کا ہنر پرویز مانوس کو آتا ہے۔ میرے خیال میں ایک بہترین ادیب کا مطالعہ نہایت وسیع ہوتا ہے وہ ادبی، لسانی اور فنی باریکیوں کا نباض ہوتا ہے۔ وہ جس خیال، واقعے، حادثے یا زندگی کے کسی ایک پہلو کو ادبی جامہ پہناتا ہے تو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈالتا ہے۔ پرویز مانوس کی کہانیوں میں تحیر اور تجسس کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی کا عنصر پوری طرح موجود ہے اور یہی خوبی ان کی کامیابی کی ضامن ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ مُٹھی بھر چھاؤں ادبی حلقوں میں اپنی چھاپ چھوڑنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سنجواں جموں

............☆☆☆............

عرضِ مُصنف

مُٹھی بھر چھاؤں میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ غالباً ۱۹۸۵ء میں میں نے دبستانِ ادب میں قدم رکھا اور ۱۹۸۹ئ سے باقاعدہ طور نے اُردو کے معتبر رسائل و جرائد میں چھپنا شروع کیا۔ جموں و کشمیر کے معتبر افسانہ نگار جناب خالد حُسین کی سرپرستی میں اتنے افسانے لکھ لئے کہ ان کو کتابی صورت دینا ناگزیر بن گیا خالد حُسین صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نے ان کو کتابی صورت دینا شروع کیا پھر ۱۹۹۵ء میں ''شکارے کی موت'' کے نام سے میرا پہلا افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آ گیا۔ الحمد اللہ اُردو کے حلقوں میں اس کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے تین ایڈیشن چھپے۔ تب سے اب تک جہلم کا بہت سارا پانی خون اور اشک بن کر بہہ گیا۔ سرِ زمین کشمیر کا چپہ چپہ زخمی ہو گیا۔ بے گناہ

لوگوں کے سر ایسے قلم کر دیئے گئے جیسے ہرے چنار کی شاخیں۔ قہقہوں کی جگہ آہوں نے لے لی۔ ہجرت کچھ لوگوں کا مقدر بن گئی۔ یتیم خانوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ گلِ لالہ کی گھٹلیاں بے نام قبروں میں دفن ہو کر رہ گئیں جو قباحتیں کشمیر پر ٹوٹیں ان کا اثر ہر ادیب کی تحریروں پر پڑنا لازمی تھا ظاہر ہے میں بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکا اور اپنے جذبات کو قلم میں سیاہی بنا کر صفحۂ قرطاس پر رقم کرنے لگا مجھے خود معلوم نہیں کہ میں نے کیا لکھا ہے البتہ نور شاہ جیسے اُستاد لوگوں نے انہیں افسانوں کا نام دیا ہے اگر واقعی یہ افسانے ہیں تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرتا ہوں کہ میں مُٹھی بھر چھاؤں کی شکل میں اُردو ادب کو کچھ دے سکا ہوں اور کشمیر کی ترجمانی کرنے میں حسبِ مقدور حصّہ ادا کر سکا۔ میرا زیادہ ترمیلان شاعری کی طرف رہا لیکن آج بھی افسانہ میری پہلی پسند ہے وہ کہتے ہیں نا کہ پہلا پیار انسان کو کبھی نہیں بھولتا یوں سمجھ لیجئے کہ افسانہ میرا پہلا عشق ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ کہانی پن کے بغیر افسانہ بے روح ہو جاتا ہے اس لئے میرے ہر افسانے میں آپ کو کہانی پن ضرور ملے گا۔ کتاب چھپ گئی لیکن کچھ حضرات کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں شکریہ اپنے بھائی ڈاکٹر مشتاق احمد وانی صاحب کا جنہوں نے اپنی نہایت ہی مصروف زندگی میں سے ناچیز کے لئے چند ساعتیں نکال کر انمول الفاظ قلم بند کئے بزرگ افسانہ نگار جناب نور شاہ کا جنہوں نے ہمیشہ میرے افسانوں کو سراہا ہور قیمتی

الفاظ تبرکاً پیش کئے جناب پروفیسر اسد اللہ وانی صاحب کا جنہوں نے اپنے زریں مشوروں سے مجھے نوازا۔

کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اپنی کاوشوں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ کرنا ناقدین کا کام ہے اُن کی جو رائے ہوگی مجھے تسلیم ہوگی مجھے اُردو حلقوں کے ادیبوں کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آپ کا رائے کا منتظر

پرویز مانوسؔ

............☆☆☆............

درد کی دہلیز

بس اڈے میں رُکی تو سبھی مسافر ایک ایک کر کے بس سے اترنے لگے اور کچھ ہی دیر میں بس کی سیٹیں خالی ہو گئیں۔ کنڈیکٹر نے آخری نظر ڈالی تو حیرانگی سے اُس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

ایک مسافر اب بھی سر کے اوپر سے کمبل لے کر سیٹ پر سویا ہوا تھا، ارے بھئی اُٹھو............ کنڈیکٹر اُسے ہلاتے ہوئے بولا،

اپنے سر سے آہستہ آہستہ کمبل اُٹھاتے ہوئے وہ کہنے لگا، شہر تو آنے دو!

یہی تو شہر ہے،، اور کون سا شہر آئے گا؟

چل اٹھ مجھے گاڑی لاک کرنی ہے،

اُس نے بھرپور انگڑائی لے کر اپنی آنکھیں ملتے ہوئے کہا،،

اتنا طویل سفر کر کے جسم کا انگ انگ دُکھنے لگا ہے، تھوڑا آرام

کرنے دو پھر چلا جاؤں گا،،

آرام کرنے کے لئے شہر میں کافی سارے ہوٹل موجود ہیں، چل اُٹھ! میرا وقت مت ضائع کر، کنڈیکٹر نے تلخ لہجے میں کہا،،

ٹھیک ہے! تو ناراض مت ہو، میں اُتر جاتا ہوں،

پھر وہ اپنا کمبل اور تھیلا سنبھال کر بس سے اُتر گیا۔

بھیڑ میں دھکم پیل سے نبرد آزما ہونے کے بعد وہ اڈے سے باہر نکلا تو سڑک کے کنارے کھڑے ایک شخص سے کاغذ کا ورق دکھاتے ہوئے اُس نے پوچھا،، مجھے اس ڈاکٹر کے کلینک پر جانا ہے۔ راستہ بتا دیجئے، مجھے نہیں معلوم! اُس شخص نے کاغذ پر ادھوری سی نظر ڈالتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اسی طرح اُس نے کافی سارے لوگوں سے نسخہ دکھاتے ہوئے پوچھا، مگر کسی کے پاس بھی اتنی فرصت نہ تھی کہ اُس کی طرف توجہ دیتا،،

تھکاوٹ کا احساس ہونے پر وہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے پیراپٹ پر بیٹھ کر سوچنے لگا ....،، ! یہاں کے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کتنے کھٹور، روکھے اور بے درد ہو گئے ہیں؟ انسانیت نام کی کوئی چیز ہی نہ رہی ان میں ....زمانہ اتنا بدل گیا کیا؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا شہر کی تپتی ہوئی سڑکوں پر چلتے چلتے اُس کے سوکھے ہوئے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے، اُس نے اُٹھ کر سڑک کے کنارے لگے ہوئے میونسپل نل کو مروڑا، بدقسمتی سے نل میں سے پانی کی ایک بوند بھی نہیں ٹپکی۔ اس نے

بے بسی کے عالم میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو اُس کی نظر سڑک کے اُس پار ایک ٹی اسٹال پر پڑی تو اُس کو اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آئی۔

وہ آہستہ آہستہ ٹی اسٹال تک پہنچا، بھائی جی! تھوڑا سا پانی پلاؤ گے؟ اُس نے دکاندار کو عاجزی سے کہا،،

پانی؟ نہیں بھئی! یہ چائے کی دُکان ہے،،

وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے پانی کی طلب ہے، دو گھونٹ پلا دو ....،، پیاس لگی ہے تو منرل واٹر لے لو۔ ہم خود ٹینکر والے سے خرید کر پانی لیتے ہیں،، بھئی خدا تمہارا بھلا کرے گا، وہ ٹی اسٹال کے باہر رکھے ہوئے بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا،،

نہیں نہیں .... یہاں نہیں ....!! یہ جگہ گراہکوں کے بیٹھنے کے لئے ہے، بھکاریوں کے لئے نہیں..........،،

وہ دُکاندار کی طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگا، جیسے پوچھ رہا ہو،،

گراہک اور پیسہ ہی سب کچھ ہے؟ انسانیت، اخلاق، ہمدردی، بھروسہ اور بھائی چارے کی یہاں کوئی قدر نہیں؟ وہ دل مسوس کر رہ گیا،،

گھور گھور کر کیا دیکھ رہا ہے؟ چل چل آگے بڑھ، کہہ کر وہ چائے بنانے میں مشغول ہو گیا،

کمال ہے! میری عمر کا.......... میری لاچاری کا.......... میری غربت کا اور میری حالت کا یہاں کے لوگوں کو ذرا بھی احساس نہیں؟

یہاں کسی کے پاس میرے لئے وقت ہی نہیں کہ کلینک تک پہنچائے،

اس کا سارا جسم درد سے دُکھ رہا تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری وہ پھر بھی چلتا رہا...... یہ سڑک اُسے کچھ جانی پہچانی لگی تو اُس کی آنکھوں میں چمک اور پیروں میں جان سی آ گئی، وہ سوچ رہا تھا، کاش وہ بھی چار جماعتیں پڑھا ہوتا تو آج کلینک تک پہنچنے میں اُسے اتنی دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا وہ کلینک تک پہنچ گیا۔ بورڈ پر نظر پڑتے ہی اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور نسخہ ہاتھ میں لئے کلینک کے اندر داخل ہو گیا۔

ہیلپر نے اُس کا نسخہ دیکھ کر کہا،، بابا تم نے آنے میں دیر کر دی، ڈاکٹر صاحب صرف بیس مریضوں کو دیکھتے ہیں اور وہ اُنہیں دیکھ چکے ہیں، اب اُن کے کلب جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

اُس نے ہیلپر کی کافی منت سماجت کی کہ نظر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ راستہ بھٹک گیا تھا اور کسی نے اُس کی مدد بھی نہیں کی۔

ہمیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں۔ چلو چلو، سائڈ ہو جاؤ ڈاکٹر صاحب نکل رہے ہین،، وہ اپنی مجبوریاں گنوا ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اپنے کیبن سے موبائیل کان سے لگائے نکلا،، وہ نسخہ ہاتھ میں پکڑ کر ڈاکٹر کے سامنے گڑگڑانے لگا، ڈاکٹر صاحب! میں سخت بیمار ہوں اور کافی دور سے آیا ہوں۔ میری مدد کیجئے، یہ غریب آپکو دعائیں دے گا، ڈاکٹر اسے نظر انداز کرتے ہوئے (ہاں ہاں بس کلب پہنچ رہا ہوں) کہتے ہوئے کلینک کے

باہر کھڑی لمبی کار میں بیٹھ کر چل دیا، اور وہ دور تک اداس نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

اتنی بے رُخی دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ پڑے، وہ اپنا سر پکڑ کر وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔

اور بابا! چلو اُٹھو............،، مجھے کلینک بند کرنا ہے، ہیلپر نے ہاتھ میں تالا اُٹھاتے ہوئے کہا،،

بیٹا! میں درد سے مر رہا ہوں، بس دس منٹ ٹھہر جاؤ، اُس نے پہلو کو ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا،،

تجھے مرنا ہے تو باہر جا کر مر ....کلینک کے اندر مر کر مجھے مصیبت میں کیوں پھنسانے لگا، کہتے ہوتے ہیلپر نے اُس کو بازوں سے پکڑ کر کلینک سے باہر نکال دیا۔ اُس نے آگے پیچھے دیکھا،،

سڑک پر لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر تھا اور رینگتی ہوئی سینکڑوں گاڑیاں۔ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی تمام لوگ نا معلوم منزل کی طرف بھاگ رہے تھے۔

وہ گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا، اُس نے نظریں اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جیسے من ہی من میں خدا سے اُس کی مخلوق کے خلاف شکایت کر رہا ہو۔

سورج کعبہ کی سمت سجدہ کرنے کے لئے جھک رہا تھا اسی کے ساتھ آسمان پر ہلکی ہلکی لالی پھیل رہی تھی۔ سفید بگلوں کا ایک طویل قافلہ اپنے

آشیانوں کی طرف محو پرواز تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اسے وقت کا احساس ہوا، اُس نے سوچا آخری گاڑی پکڑ کر واپس گھر چلا جائے گا، اسی غرض سے وہ تھکے قدموں سے بس اڈے کی طرف چل پڑا۔ اڈے کے نزدیک پہنچ کر اس کے کانوں میں کوؤں کا شور پڑا۔ یہ شور اُس نے صبح بھی سنا تھا لیکن اس وقت اس نے اس شور پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اب جب اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو کوؤں کا ایک غول کائیں کائیں کرتے ہوئے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اڑ رہا تھا۔ وہ ان کے قریب جانے لگا تو شور میں مزید اضافہ ہونے لگا۔

اُسے اپنی جانب آتے دیکھ کر کوئے اُس کے سر پر منڈلانے لگے۔ وہ کافی غصے میں لگ رہے تھے، اُس کو لگا کہیں یہ کوّے اسے نوچ نوچ کر زخمی نہ کر دیں، اس دوران دو چار چونچیں اُس کے سر پر بھی لگیں تھی.........کوّوں کا شور تو اُس نے پہلے بھی کئی بار سنا تھا۔ لیکن اس شور میں عجیب سا درد تھا۔ ایک تڑپ تھی۔ کسک تھی اتنے سارے کوّوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا،، آخر ماجرا کیا ہے؟

ان کوّوں نے اتنا شور کیوں مچا رکھا ہے............؟ کچھ تو بات ضرور ہے؟ اسی ادھیڑ بُن میں وہ آگے بڑھا تو اس کی نظر میدان میں پڑے اُس مردہ کوّے پر پڑی جس کے ارد گرد بہت سارے کوّے کاں کاں کی آواز میں بین کرتے ہوئے اپنے ساتھی کی موت پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ کوّوں میں ہمدردی کا یہ جذبہ دیکھ کر اُسے اپنے آپ کو انسان کہلوانے پر شرم محسوس ہوئی............"

☆☆☆............

قُدرت

جونہی ڈاکٹر نصرت نے اپنے یاقوتی لبوں سے یہ جملہ ادا کیا
''نوشی'' ماں بننے والی ہے۔تو بیگم عثمانی کے قدم خوشی کے مارے خودبخود سیڑھی کے زینے اترنے لگے۔پل بھر میں اس نے گھر کے تمام نوکروں کو لابی میں اکٹھا کرلیا اور مٹھائی تقسیم کرتے ہوئے کہنے لگی، سنا تم نے! میرا عدنان باپ بننے والا ہے.........تمام نوکر حیران تھے کہ ہمیشہ کرخت لہجے میں حکم چلانے والی مالکن آج کتنی شیریں اور شائستہ زبان میں اپنی خوشی کا اظہار کررہی ہے.........''تمام نوکر مٹھائی لے کر کے اپنے اپنے کام پر چلے گئے تبھی بیگم عثمانی کو خیال آیا کہ ڈاکٹر نصرت کو تو وہ مٹھائی دینا بھول ہی گئیں۔اس نے بالکونی کی طرف دیکھا مگر ڈاکٹر نصرت جا چکی تھی۔بیگم عثمانی وہیں صوفے پر بیٹھ کر خیالوں کی دنیا میں کھو گئی.........''
امی جان کی آواز پر وہ چونک گئی،سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے عدنان کھڑا مسکرا

رہا تھا۔ بیگم عثمانی نے صوفے سے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور بے تحاشہ اس کی پیشانی چومنے لگی۔ عدنان حیران تھا کہ آج ایسی کیا خاص بات ہوگئی جو ماں اس قدر خوش ہے؟ جب ماں نے اسے بتایا کہ ''نوشی'' امید سے ہے تو عدنان کی بھی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھ کر ''نوشی'' کے کمرے کی طرف بڑھ گیا .... رات کا دوسرا پہر تھا آسمان نے ستاروں کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ چاند اپنے حسن کے نور سے اندھیرے کے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے ساری کائنات کو منور کر رہا تھا .... ''نوشی'' اپنے عالیشان بیڈ روم میں عدنان کے سینے پر سر رکھ کر سینے کے بالوں کو سہلا رہی تھی کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ جیسے دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ دفعتاً عدنان سکوت توڑتے ہوئے ''نوشی'' سے مخاطب ہوا، ''نوشی''! ہوں؟ کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟ نوشی نے اپنے چہرے سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے پوچھا، یہی کہ ہم اپنے آنے والے بچّے کا نام کیا رکھیں؟ نہیں! تو پھر؟ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آج تم کتنے خوش ہو! بس میں تمہیں ہمیشہ اسی طرح خوش دیکھنا چاہتی ہوں ....سچ؟ عدنان نے نوشی کو اپنی بانہوں میں بھینچتے ہوئے کہا، اچھا بتاؤ تم نے کون سا نام منتخب کیا ہے؟ نوشی نے معصومیت سے پوچھا، کاشف! کیوں ہے نہ اچھا نام؟ ....اور جناب اگر بیٹی ہوئی تو؟ نوشی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا، بیٹی کا لفظ سن کر تو جیسے عدنان کو بچھو نے ڈنک مار دیا .... وہ خفا ہو کر بولا ''کیوں؟ بیٹی کیوں ہوگی؟

بیٹا کیوں نہیں؟ کیونکہ جناب خدا نے دو ہی پھل رکھے ہیں۔ بیٹی اور بیٹا! آگے قدرت کی مرضی! نوشی نے پیار سے عدنان ناک پکڑتے ہوئے کہا، ارے تم تو ناراض ہو گئے؟ اور نہیں تو کیا، تم نے سارا موڈ ہی خراب کر دیا۔ عدنان نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا، اچھا اب سوچنا چھوڑو اور سو جاؤ صبح جلدی آفس جانا ہے کہہ کر نوشی نے کمرے کی بتی بجھا دی اور خود عدنان کی پیٹھ سے لپٹ گئی، سرسبز لان میں بیگم عثمانی کرسی پر بیٹھ کر سوچ رہی تھی کہ کتنا خوبصورت ہوگا وہ منظر جب اس کا پوتا ننھے ننھے قدموں سے اس لان میں تتلیوں کے پیچھے بھاگے گا پھر جب وہ اپنی توتلی زبان سے ڈاڈی ڈاڈی پکارے گا تو وہ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا کر خوب پیار کرے گی۔ وہ خیالوں کی دنیا میں نہ جانے کب تک گھومتی رہتی اگر نوشی کی سماعت اس کے کانوں سے نہ ٹکراتی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو نوشی چائے کا کپ لے کر کھڑی تھی۔ وہ نوشی کو ایک ٹک دیکھتی رہی آج اسے نوشی پر بے حد پیار آ رہا تھا۔ شاید اسی لئے کہ نوشی اس خاندان کو ایک وارث دینے والی تھی۔ بیگم عثمانی نے چائے کا کپ لے کر تپائی پر رکھا اور نوشی کا ہاتھ پکڑ کر پاس والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولی، بیٹی! یہ دن تمہارے کام کرنے کی نہیں آرام کرنے کے ہیں۔ آج سے تم کام نہیں کرو گی .... لیکن امی جان وہ .... بس! میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا .... بیگم عثمانی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی، نوشی اس وقت اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب بہو سمجھ رہی تھی۔

..........ایک روز شام کو جب تینوں کھانے کی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے تو بیگم عثمانی بیٹے سے مخاطب ہوئی، عدنان! تم کل کچھ کہہ رہے تھے کہ آجکل یہاں بھی کوئی ایسی مشین آئی ہوئی ہے جس سے قبل از وقت ہی پتہ چل جاتا ہے کہ بطن میں نر ہے یا مادہ جنس! ہاں امّی جان! ناصر بھائی جان کہہ رہے تھے کہ آج کل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے "الٹرا ساونڈ" کے سیکس ڈیٹرمینیشن ٹیسٹ سے صاف پتہ چل جاتا ہے! بیٹا میں چاہتی ہوں کہ تم بھی نوشی کا یہ ٹیسٹ کروالو تا کہ ہمیں بھی تسلی ہو جائے ....ٹھیک ہے امّی جان! میں کل ہی نوشی کا Sex Determination Test کروالیتا ہوں، کیوں نوشی؟ ٹھیک ہے نا؟ ارے۔! تم خاموش کیوں ہو؟ نوشی نے نظریں فرش پر گاڑتے ہوئے کہا، ماں جی! خدائی راز کو آشکار کرنا گناہِ عظیم ہے پھر خداوند کریم کو اپنے قانون میں کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں......میں تو اس گناہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی..........تم تو جب دیکھو خدا خدا کرتی رہتی ہو عدنان بھی تو تمہارا مجازی خدا ہے اس کا حکم بجالانا تمہارا فرض ہے۔کیا تم اپنا فرض نبھا رہی ہو؟ بیگم عثمانی کا جذباتی جواب سن کر نوشی لاجواب ہوگئی اور یہ ٹیسٹ کرانے کے لئے راضی ہوگئی.......... اگلے دن جب عدنان ٹیسٹ کی رپورٹ لے کر گھر پہنچا تو رپورٹ دیکھ کر بیگم عثمانی کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے، وہ آگ بگولا ہو اٹھی..........اس کے تیور ہی بدل گئے..........اس کا یہ روپ دیکھ کر تو نوشی ڈر ہی گئی..........دو چار دن تو قیامت کے گذرے۔نوشی کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے

تھے۔اپنے ساتھ ہونے والے برتاؤ کو دیکھ کر اسے شک ہو رہا تھا کہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آجائے..........اس کا شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب بیگم عثمانی نے سخت الفاظ میں حکم سنادیا کہ وہ اپنا حمل گرادے.......... یہ جُملہ سُن کرنوشی نے ایک زوردار دھماکہ محسوس کیا جس کے شعلے نہ جانے کتنی بلندیوں تک اٹھے اورنوشی کی ساری خوشیوں، ارمانوں اور آرزوؤں کو خاکستر کر گئے۔وہ دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر چیخی..........

نہیں..........!! نہیں! یہ ایک طرح کا قتل ہے۔میرے اندر نئی زندگی کی جو شمع روشن ہونے جارہی ہے۔اسے میں کیسے اپنے ہاتھوں سے بجھاؤں؟ خدا کے واسطے میری ممتا کا گلا مت گھونٹو! وہ دونوں کے آگے گڑ گڑانے لگی۔دیکھو نوشی جذباتی مت بنو! اس وقت دل سے نہیں دماغ سے کام لو۔ماں ٹھیک کہتی ہے ابارشن کرالو......!

عدنان کی باتیں سن کرنوشی کا دماغ ماؤف ہو گیا۔نوشی آنسو بہاتے ہوئے بولی، عدنان تم تو اس سماج کو ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہو، اس شہر کے لوگ تمہارے خیالات کی تعریف کرتے تھے پھر بھی تم..........نوشی! جو تم نے سنا تھا وہ سب کتابی باتیں تھیں اور جواب تم دیکھ رہی ہو وہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا..........تم سمجھتی کیوں نہیں؟ آخر مجھے بھی تو اپنے خاندان کے لئے وارث چاہیے جو صرف لڑکا ہوسکتا ہے لڑکا..........جس کے لئے میں زیادہ انتظار نہیں کرسکتا..........!!!

نوشی کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی وہ سسکیاں لیتی

ہوئی بولی، عدنان مجھے بے حد افسوس ہے کہ اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے باوجود تمہارا ذہن چودھویں صدی کی جھاڑیوں میں الجھا ہوا ہے۔ امی جان! آپ خود بھی تو ایک عورت ہیں مجھ پر نہیں تو اس ننھی سی جان پر رحم کیجئے۔ میری کوکھ مت اجاڑیئے میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ بیگم عثمانی پر اس کی باتوں کا ذرا بھی اثر نہ ہوا، وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی، اے لڑکی! بند کر یہ ڈرامہ! مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں، مجھے صرف لڑکا چاہیے لڑکا..........! نوشی پھر عدنان کے آگے گڑگڑانے لگی، عدنان قدرت کا مذاق مت اڑاؤ.......... اس کی لاٹھی بے آواز ہے ورنہ ایک دن تمہیں پچھتانا پڑے گا..........عدنان اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا، جب دیکھو قدرت، قدرت، قدرت! جیسے میرا وجود تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ عدنان بیٹے! مجھے لگتا ہے یہ لڑکی ایسے نہیں مانے گی.......... اسے طلاق دے دو!!!

ایک بار پھر نوشی پر بجلی گر پڑی.......... اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ لوگ اتنا بھی گر سکتے ہیں.......... وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی، نہیں نہیں امی جان! مجھ پر اتنا بڑا ظلم مت کیجئے! میری زندگی برباد ہو جائے گی .... واہ اپنی زندگی کا تمہیں بڑا خیال ہے مگر ہمارے خاندان کی عزت اور وقار کا تمہیں ذرا بھی خیال نہیں؟ دیکھ لڑکی! اگر تم ابارشن کے لئے راضی نہ ہوئی تو ہم ایسا ہی کریں گے .... ''بیوی کو شوہر کا سہارا ہوتا ہے جب شوہر ہی منہ پھیر لے تو عورت کا ٹوٹ جانا فطری ہوتا ہے۔ نوشی کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نکل گئی وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی

.........وہ دونوں ماں بیٹے نوشی کو نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے ....نوشی اپنے کمرے میں گھنٹوں پر سر رکھ کر آنسو بہاتی رہی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور سر کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے ابھی وہ سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ بیگم عثمانی کی کرخت آواز نے اس کی سوچ کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا ....پتہ نہیں کہاں مر گئی یہ لڑکی؟ ذرا جلدی کر ڈاکٹر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہی تھی جیسے کسی شبھ کام کا مہورت نکلا جا رہا ہو۔ آج پھر شہر کے ایک نرسنگ ہوم میں ایک اور ننھی سی جان کو فنا کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں روزانہ جانے کتنی ہی معصوم جانوں کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی مٹا دیا جاتا تھا۔ اب تو یہ نرسنگ ہوم ایک مکمل قتل گاہ بن گیا تھا۔ لیکن وہ کرتی بھی کیا......... ایک مجبور اور بے بس عورت.........اس کے ایک انکار سے اسے زندگی بھر طلاق کا طوق گلے میں ڈال کر باپ کے گھر میں بیٹھنا تھا۔ اس نے سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا۔ جس نے اس ننھی سی جان کو وجود بخشا تھا.........وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ کے باہر کھڑی کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ عدنان نے کار اسٹارٹ کی تو ماں گھڑی دیکھتے ہوئے بولی، بیٹا ذرا رفتار تیز کرو! ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں یہ نہ ہو کہ ڈاکٹر دوسرا کیس شروع کر دے ....عدنان نے ایکسلیٹر پر مزید دباؤ ڈالا تو چند ہی لمحوں میں کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ رفتار دیکھ کر نوشی ڈر گئی ایک دو مرتبہ اس نے عدنان

سے کہا بھی کہ رفتار کم کرو۔ پر اس بیچاری کی سنتا ہی کون تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹے تو جلد سے جلد اس مصیبت سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ دونوں نہ جانے کن خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک کار بے قابو ہو کر ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گئی پھر ایک شور اٹھا۔ لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی۔ بیگم عثمانی موقعے پر ہی دم توڑ گئی ....

اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ کے دو بیڈوں پر عدنان اور نوشی لیٹے ہوئے تھے۔ عدنان اب پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ ڈاکٹر شرما کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں بازگشت کر رہے تھے کہ عدنان صاحب! مجھے نہایت ہی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ اب کبھی باپ نہیں بن سکتے۔ دو گرم گرم اشکوں کے قطرے اس کے رخساروں پر پھسل گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے بیڈ سے اٹھا اور نوشی کے بیڈ کے قریب پہنچا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا' نوشی! نوشی تم ٹھیک ہو نا؟ تم ٹھیک کہتی تھی قانونِ [illegible] میں کسی کو بھی مداخلت کی اجازت نہیں .... نوشی کپکپاتے [illegible]وں سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ [illegible] وہ سسکیاں لینے لگی تو عدنان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے [illegible]، نوشی نہ! بیٹی ہی سہی ہم اپنی اولاد کو بڑے پیار سے پالیں گے [illegible]ے کو کیا معلوم کہ اس حادثے میں نوشی کا حمل ضائع ہو چکا تھا۔

............☆☆☆............

سفید خون

جب سے دینا ناتھ کی رفیقۂ حیات ملک عدم سُدھار گئی تھی تب سے وہ بہت ہی ناتواں ہو گیا تھا۔ نہ کسی سے زیادہ بولتا۔ نہ کسی کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھتا۔ بس چُپ چاپ ہر وقت اپنے کمرے میں گُھسا رہتا۔ سارا گاؤں بخوبی آشنا تھا کہ دینا ناتھ کو اپنی شریک زندگی سے کس قدر الفت تھی۔ کیونکہ ایک تو وہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ دوسرا وہ دینا ناتھ سے عمر میں چھوٹی بھی تھی۔ دینا ناتھ کو اپنی بیوی سے اولاد سے بھی زیادہ پیار تھا۔ وہ ہمیشہ کہتا "پہلے بیوی آتی ہے پھر اولاد...... پیار ہوتا بھی کیوں نہ؟ ساری برادری کی مرضی کے خلاف اس نے دینا ناتھ کا ہاتھ تھاما۔

پہلی بیوی سے دینا ناتھ کو دو بیٹے تھے۔ بشن اور کشن، شیلا سے ایک بیٹی تھی جسے اس نے بڑے نازوں سے پالا تھا۔ وہ بھی اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ بیٹے تو شادی شدہ تھے۔ فکر تھی تو بس بیٹی کی۔ شیلا

سے دینا ناتھ کی والہانہ محبت دیکھ کر گاؤں کا نمبردار اکثر کہتا " ارے دینا ناتھ میں سوچتا ہوں شیلا کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ دینا ناتھ کہتا " ایسا مت کہئے لمبردار صاحب! بھگوان شیلا کو میری عمر بھی دے دے۔ اولاد کا کیا ہے؟ بیٹے تو شادی کر کے بیویوں کے ہو جائیں گے۔ رہی بیٹی تو وہ پرائے گھر چلی جائے گی۔ لے دے کر شیلا ہی میرا سہارا ہے۔ میں تو بھگوان سے ہر گھڑی یہی پرارتھنا کرتا ہوں کہ جب بھی موت آئے تو ایک ساتھ.........."۔

لمبردار اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہتے " ارے بھئی یہ تو بھگوان ہی جانتا ہے کہ پہلے ہری ڈال ٹوٹے گی یا سوکھی۔ دینا ناتھ شیلا کے اخلاق، اس کی کفایت شعاری اور فرمانبرداری کو یاد کر کے روتا رہتا اور سوچتا " کتنا خیال رکھتی تھی وہ اس کا۔ اس کے گھر کا، صبح سویرے اٹھ کر چائے بناتی، آنگن میں جھاڑو لگاتی۔ مویشیوں کو چارہ ڈالتی، گوبر وغیرہ جمع کر کے اُوپلے تھاپتی اور دیوار سے چمیڑ دیتی۔ شیلا کے جانے کے بعد تو جیسے اس گھر کا جنازہ ہی نکل گیا تھا۔ مویشی بھی ایک ایک کر کے بک چکے تھے۔ اب تو لے دے کر بیلوں کی ایک جوڑی رہ گئی تھی۔ پتہ نہیں وہ بھی کب بک جائے؟ بہویں تو اپنے اپنے شوہروں کو لے کر بیٹھی ہیں۔ بس ایک بار بیٹی کا بوجھ سر سے اتر جائے پھر چاہے آنکھوں پر مٹی پڑ جائے۔ یہ بھائی اسے کیا بیاہیں گے جو میرے جیتے جی اسے پوچھتے تک نہیں......اپنی بیویوں کو ہر مہینے نئے سوٹ لا کر دیتے ہیں اور بہن کے لئے سال بھر میں دو جوڑے، ایک گرم اور ایک

سرد...... بہویں تو صرف جائیداد کا بٹوارہ کرنے پر تلی ہوئیں تھیں۔ پھر دینا ناتھ سوچتا "اگر جائیداد کا بٹوارہ کر دیا، تو پھر بیٹی کی شادی کیسے کرے گا۔ اسی لئے اس نے دوسرے گاؤں میں موجود تھوڑی سی زمین چپ چاپ بیچ دی اور بیٹی کی شادی بڑے دھوم دھام سے کر دی۔ زمین بیچنے کا علم بیٹوں کو اس لئے نہیں ہو سکا، کیونکہ دینا ناتھ نے بڑی چالاکی کے ساتھ وہ زمین اپنے ایک خاص دوست کو بیچی تھی۔ اس کے بیٹوں نے کافی سراغ لگایا کہ معلوم ہو سکے بوڑھے نے روپے کہاں سے لائے؟ لیکن بے سُود۔

لوگوں کا کیا ہے وہ تو باتیں کرتے ہی رہتے ہیں ایک دن دینا ناتھ کی بڑی بہو کانتا پنگھٹ پر پانی بھر رہی تھی۔ وہاں پہلے سے ہی کچھ عورتیں پانی بھرنے کی غرض سے موجود تھیں۔ ایک عورت کانتا سے کہنے لگی "اری کانتا! تمہارا سسر کام کرتا ہے نہ کاج...... پھر بھی اس نے بیٹی کو اتنا جہیز دے کر وداع کیا۔ آخر اس نے اتنا روپیہ لایا کہاں سے؟ کانتا پیتل کا گھڑا دھوتے ہوئے بولی "پتا جی کہہ رہے تھے کہ ایک دوست نے مہربانی کی ہے۔ شاید ادھار لئے ہوں گے! دوسری عورت پانی کا گھڑا ایک طرف رکھتے ہوئے بولی "میری ساس تو ان کے خاندان کو برسوں سے جانے ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ دینا ناتھ کے باپ کے پاس سونے کی اینٹیں تھیں اور اب وہی اینٹیں دینا ناتھ کے پاس ہیں انہی میں سے کچھ اینٹیں بیچ دیں ہوں گی" دوسری عورت نے پلو نچوڑتے ہوئے کہا "کمال ہے! آپ لوگوں کو آج تک پتہ ہی نہیں چلا؟ یہ بات سُنتے ہی کانتا کی آنکھیں پھٹی کی

پھٹی رہ گئیں۔ وہ پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے جلدی جلدی گھر پہنچی......۔

رات کو کانتا نے اپنے پتی کے اچھی طرح کان بھرے۔ کہنے لگی" ہم بھی سوچیں یہ بڈھا دن رات کمرے میں کیوں گھسا رہتا ہے؟ اسی لئے تو وہ جائیداد کا بٹوارہ نہیں کرتا۔ اگر آپ دونوں بھائیوں نے جلدی کوئی قدم نہیں اٹھایا تو وہ بڈھا اپنی ساری پونجی اپنی لاڈلی بیٹی پر لٹائے گا۔ پھر بجاتے رہنا گھنٹیاں! لوگوں کے در پر۔ کانتا کی باتیں سن کر بشن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ہمارے باپ نے آج تک ہم سے یہ بات کیوں چھپا رکھی؟ والدین اولاد کے لئے کیا کیا نہیں کرتے! اپنی خوشیاں تک تیاگ دیتے ہیں۔ سونے کی اینٹیں بیچ کر کچھ روپے ہمیں دیتا تو ہم بھی کوئی اچھا سا کاروبار کرتے۔ لیکن اس باپ نے تو ہمارا مستقبل ہی تاریک کر دیا۔ وہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا..........

بہت دنوں سے دینا ناتھ محسوس کر رہا تھا کہ گھر کا ہر فرد اس سے کھچا کھچا سا رہنے لگا ہے .... کوئی بھی دل کھول کر بات نہیں کرتا۔ کیا بیٹے۔ کیا بہویں۔ کھانا اس کے آگے رکھتے، تو اس طرح جیسے کسی بھکاری کے آگے رکھتے ہوں۔ وہ سوچتا آخر اس سے کون سی خطا ہو گئی ہے؟ اپنے ساتھ ہونے والے اس برتاؤ کے سبب اسے شیلا کی یاد آتی تو اسکی آنکھوں سے موتی چھلکنے لگتے۔ وہ اٹھ کر چُپ چاپ کمرے میں گھس جاتا اور اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے پہروں آنسو بہاتا .... ایک دن دوپہر کو مکان کے صحن میں دینا ناتھ ہل کو ہتھوڑی سے جوڑ رہا تھا کہ اتنے میں اس کا چھوٹا

بیٹا۔کشن اس کے پاس آ پہنچا کہنے لگا" پتا جی! الماری کی چابی دیجئے میں نے الماری میں سے زمین کے انتقال کے کاغذات نکالنے ہیں۔تا کہ لون کے لوازمات پورے کرسکوں! دینا ناتھ جو کہ کام میں مصروف تھا بولا" بیٹا میں کام ختم کرلوں تو پھر تمہیں کاغذات نکال کر دونگا۔اس الماری میں اور بھی کچھ سامان ہے وہ ادھر اُدھر ہو جائے گا۔کشن جو باپ کو ٹٹول رہا تھا، طیش کھا کر بولا" آپ چابی اس لئے نہیں دیتے کیونکہ اس الماری میں سونے کی اینٹیں ہیں۔یہ بات سُن کر دینا ناتھ کے ہاتھ میں چلتا ہوا ہتھوڑہ تھم گیا ۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا،، مچھیرا اپنی ماں کھاتا تھا لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مچھلیاں کھاتا ہے۔بیٹا! تو بھی لوگوں کی باتوں میں آ گیا؟ بیٹا! اس الماری کے اندر سونے کی اینٹیں ہی نہیں میری جان بھی بند ہے۔سوچتا ہوں تمہاری عقل کو کیا ہو گیا؟ یہ باتیں سن کر کشن کا شک اور بھی مضبوط ہو گیا۔وہ ایڑی زمین پر مارتے ہوئے وہاں سے چلا گیا......

کائنات نے اندھیرے کی کالی چادر اوڑھ لی تھی دینا ناتھ کے دونوں بیٹے بشن اور کشن اپنی بیویوں سمیت کمرے میں لالٹین جلائے بیٹھے اس مسئلے پر غور کرنے میں مصروف تھے کہ یہ ساری دولت کس طرح حاصل کی جائے......اتنے میں دینا ناتھ کی بڑی بہو کانتا بولی" دیکھتے کیا ہو! مار ڈالو بڈھے کو گلا گھونٹ کر......لوگوں کو ویسے بھی معلوم ہے کہ وہ بیوی کے غم میں نڈھال ہوا ہے۔کشن کے خون نے جوش مارتے ہوئے کہا" نہیں نہیں

ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ آخر وہ ہمارا باپ ہے۔ تو پھر کرتے رہو دن بھر ٹھیکیداروں کے ساتھ مزدوری.........!

اس نے کون سا باپ ہونے کا فرض نبھایا ہے؟ بشن نے بھائی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا'' کچھ دیر کمرے میں خاموشی کا راج رہا پھر کشن بولا ''ٹھیک ہے۔ یونہی صحیح! مگر میری ایک شرط ہے! وہ کیا؟ بشن چونک پڑا ......وہ یہ کہ الماری کے اندر سے جو کچھ بھی نکلے گا وہ برابر دو حصوں میں تقسیم ہوگا۔ یہ شرط سن کر بشن سوچ میں پڑ گیا لیکن کانتا ایک دم بول اٹھی'' ہاں ہاں ہمیں یہ شرط منظور ہے! مگر پہلے اس سانپ سے تو جان چھڑاؤ جو خزانے پر کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے......آخرکار دونوں بھائی اس بات پر متفق ہو گئے کہ یہ پاپ وہ ضرور کریں گے اور آج رات ہی بڈھے کو گلا گھونٹ کر مار ڈالیں گے۔ ان کا یہ فیصلہ سن کر لالٹین کی لو پھڑ پھڑانے لگی شاید وہ آدم کی کرتوت پر آنسو بہا رہی تھی جو بشن اور کشن کو دکھائی نہ دے رہے تھے...........

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ سارا عالم گہری نیند میں سو رہا تھا اگر کوئی جاگ رہا تو وہ تھا شیطان اور اس کے دو چیلے بشن اور کشن۔ بھادوں کی کالی اندھیری رات، دور سے کسی کُتے کے رونے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ شاید کتے نے موت کے قدموں کی چاپ محسوس کر لی تھی۔ دونوں بھائی کمرے سے نکلے اور دُزدیدہ نظروں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا، جہاں کانتا اُن کا حوصلہ بڑھاتے

ہوئے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ پھر دونوں بھائی لالچ میں اندھے ہو کر دینا ناتھ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ جونہی وہ دروازے تک پہنچے تو پہلے زوردار بادل گرجے پھر زور کی بجلی کڑکی جس سے ساری کائنات دہل گئی، لیکن ان دو بھائیوں پر اس کا رتی بھر بھی اثر نہ ہوا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ بجلی کی کڑک کو نظر انداز کرتے ہوئے بشن نے دروازے پر دستک دی تو دستک سُن کر دینا ناتھ کی آنکھ کُھل گئی۔ وہ ہڑ ہٹ ہٹ میں اندر سے پوچھ بیٹھا "کون ہے آدھی رات کو؟ ہم ہیں پتا جی! بشن اور کشن۔ کیا بات ہے خیریت تو ہے؟ بشن گھبرایا ہوا بولا" پتا جی نیلم بھابی دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے دائی ماں کے پاس چلنا ہے ذرا جلدی کیجئے! دینا ناتھ اندھیرے میں ہی آہستہ آہستہ دروازے تک پہنچا اور کُنڈی کھول دی۔ دروازے کے کواڑ کھلتے ہی دونوں بیٹے اس پر جھپٹ پڑے۔ وہ بے چارہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا کشن نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دینا ناتھ کے دونوں ہاتھ کس کے پکڑ لئے اور بشن نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبائے رکھا۔ دینا ناتھ نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر اپنے ہی خون کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد دینا ناتھ کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور پھر اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ اتنے میں ایک اور بجلی کڑکی ...... لاش کو وہیں پھینک کر بشن نے ساتھ لائے ہوئے ہتھوڑے سے الماری کا تالا توڑنا شروع کر دیا۔ کشن پاس ہی کھڑا تھا اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ کس وقت وہ سونے کی اینٹوں کا حصہ دار بن جائے۔

اندھیرے میں ایک ہتھوڑا بشن کے ہاتھ پر پڑا جس سے وہ کراہ اُٹھا۔ بڈھے نے علی گڑھ کا پکا تالا لگایا ہے ٹوٹتا ہی نہیں! بشن دانت پیستے ہوئے بولا'' مجھے دکھا ہتھوڑا۔ پھر کشن زور آزمانے لگا......دو چار ہتھوڑے پڑنے کے بعد الماری کا تالا کھٹ سے ٹوٹ گیا......ٹوٹ گیا؟ بشن نے بے صبری سے پوچھا'' ہاں ٹوٹ گیا۔ تُو لالٹین جلا۔ بشن نے جلدی جلدی جیب سے دیا سلائی نکال کر لالٹین جلائی۔ سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ پھر دونوں بھائی لالٹین کی روشنی میں الماری میں رکھے ہوئے سامان کو ہاتھوں سے ٹٹولنے لگے۔ وہاں سونے کی اینٹیں نہ پاکر دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کشن بولا'' بڈھا بڑا چالاک ہے اس نے اینٹیں چُھپا کر رکھی ہوں گی اوپر کے خانے میں دیکھو ذرا!......بشن نے فوراً لالٹین اوپر کے خانے کی طرف بڑھائی تو روشنی میں دونوں بھائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس خانے میں سونے کی اینٹیں نہیں بلکہ انکی ماں شیلا کی ایک قد آور تصویر کے سوا کچھ نہ تھا دفعتاً لالٹین بشن کے ہاتھ سے گر گئی............

............☆☆☆............

خراشیں

جب سے اس نے سُن رکھا تھا کہ بہت پہلے کسی آدم نے چاند پر قدم رکھا ہے۔ تب سے اس کے دل میں یہ خواہش انگڑائی لینے لگی تھی کہ وہ بھی چاند پر جائے۔ اسی لئے جب بھی گھر کے بڑے بزرگ قدرت کی بنائی ہوئی کائنات کے بارے میں بات کرتے وہ بھی کان لگا کر ان کی باتیں غور سے سُنتی رہتی۔ اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا، جب بچپن میں پڑوس کی موسی اس سے پوچھتی، بیٹی چندا ماما کہاں ہے؟ تو وہ اپنی ننھی سی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہتی، چندا ماما وہ ہے............" اس کی یہ اٹکھیلیاں دیکھ کر موسی کہتی، میں صدقے جاؤں ان ننھّے مُنے ہاتھوں پر سے........... کتنے پیارے پیارے دودھ کی طرح سفید ہاتھ ہیں میری بچّی کے! اور پھر موسی اس کے ہاتھوں کو دیوانہ وار چُوم لیتی .... موسی ہی کیا، گاؤں کے سبھی لوگ کہتے دینوں کی بیٹی کے ہاتھ کتنے خوبصورت

ہیں۔ بالکل چاند کی طرح.......... شاید یہی تعریفیں سُن سُن کر گھر والوں نے اس کا نام ''پری'' رکھ دیا تھا۔ ہر شام کو جب آفتاب کوہساروں کے پیچھے دیوداروں کے جنگل میں اندھیرے کی اوڑھنی اوڑھ لیتا تو مشرق سے چاند اپنا دودھیا مکھڑا دکھاتا تو ''پری'' دیر تک مُنڈیر پر بیٹھ کر اس کی طرف تکتی رہتی دل ہی دل میں سوچتی، اگر اسے معلوم ہو جائے کہ چاند پر پہنچنے کا راستہ کہاں سے ہے تو وہ آج ہی چاند پہنچ جائے۔ پھر بہار کی آمد پر چاند نکلتے نکلتے چمگادڑوں کی ٹولیاں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف اڑان بھرتیں تو ''پری'' یہ خوبصورت منظر اپنے گھر کے آگے والی جھیل میں دیکھ کر بے حد خوش ہوتی اور سوچتی کاش وہ بھی پنچھی ہوتی تو اڑان بھر کر چاند پر پہنچ جاتی، مگر قدرت نے تو اسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا فرمایا تھا۔ جس کے لئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں۔ آخر کار وہ اپنے دل کو تسلی دے کر سمجھا لیتی۔ مگر اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور وہ چاند پر پہنچ جائے گی۔ ایک شام آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''پری'' دوڑتے دوڑتے دادی ماں کے پاس جا پہنچی اور اس کی گود میں بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی دادی ماں۔ دادی ماں! آج چاند کیوں نہیں نکلا؟ دادی ماں نے ٹالتے ہوئے کہہ دیا، بیٹی آج بادل چھائے ہوئے ہیں اس لئے چاند دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن ''پری'' الٹے سیدھے سوالات کرنے لگی کہ بادل کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ یہ کتنی دیر تک رہیں گے؟ دادی ماں نے بھی کوئی دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تھے اس نے

''پری'' کے سر پا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، بیٹی! چندا ماما کی شادی ہوگئی ہے اور وہ سسرال گیا ہوا ہے وہ کل تک لوٹ آئے گا۔ تب جا کر کہیں ''پری'' نے چُپ سادھی۔ لیکن سوچتی رہی کہ وادی سے یہ بھی پوچھ لے کہ چاند پر جانے کا راستہ کہاں سے ہے؟ جب وادی ماں نے جان چھڑانے کے لئے کہہ دیا کہ سامنے کے پہاڑ سے چاند بہت قریب ہے وہاں سے ہی چاند پر چڑھا جاسکتا ہے۔ دادی کو معلوم تھا کہ پہاڑ کی بلندی دیکھ کر وہ چُپ ہوجائے گی دادی نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا تو چھڑا لیا لیکن یہ بات ''پری'' کے دل ودماغ میں گھر کر گئی کہ پہاڑی پر سے چاند بالکل قریب ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ''پری'' کے جسم پر جوانی کے بیج پھوٹنے لگے۔ بیج رفتہ رفتہ پودے بن گئے۔ پھر ان پودوں پر کلیاں چٹکنے لگیں اور ان کلیوں کی مہک سارے گاؤں میں پھیل گئی پھر ''پری'' کو گاؤں کا ہر جوان لڑکا چاند لگنے لگا انہی میں سے ایک چاند گلفام بھی ''پری'' کو پانے کی خواہش رکھتا تھا۔ اب ''پری'' کے دل میں چاند کو پانے کی خواہش شدید زور پکڑنے لگی، کافی دنوں کے بعد جب چاند دوبارہ محبوب کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی شکل میں آسمان پر نمودار ہوا تو پری نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب کی بار وہ چاند کو پاکر ہم دم لے گی۔

وہ گھر سے پہاڑ پر چڑھنے کے لئے نکلی تو راستے میں ''گلفام'' بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ ''پری'' نے سوچا، چلو ساتھ رہے گا۔ انہوں نے دوپہر سے ہی پہاڑ پر چڑھائی شروع کردی اور اندھیرا ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ''پری'' چاروں طرف اونچے اونچے دیودار دیکھ کر

خوف کھانے لگی۔ مہتاب کی دودھیا چاندنی رفتہ رفتہ پہاڑوں کے چاروں سمت میں پھیلنے لگی۔ تو "پری" نے اپنے پیارے پیارے دودھ جیسے سفید ہاتھ دیوداروں کے درمیان سے آسمان کی طرف بڑھائے اس نے اپنی ایڑیاں اوپر اٹھا کر بہت کوشش کی وہ چاند کو چُھو سکے مگر چاند تک اس کے ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ مجبور ہو کر اس نے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لئے پر اسی دوران دیوداروں کی شاخوں سے اس کے ہاتھوں پر خراشیں پڑ گئیں۔

............☆☆☆............

برگشتگی

سیٹھ کریم خان کی خاندانی حویلی دُلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ حویلی کے چاروں طرف روشنی کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ قُمقموں کی جگمگاہٹ عجیب نظارہ پیش کررہی تھی۔ ڈیکوریشن والے نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ بالکل صبح کا عالم محسوس ہورہا تھا۔ سارا اندر ڈھولک کی تھاپ سے گونج رہا تھا۔ دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کی آمدورفت جاری تھی۔ سیٹھ کریم خان مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔

خان صاحب ایک مالدار شخص تھے۔ سارے شہر میں ان کے برابر کوئی نہیں تھا۔ اللہ کی شان، انہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ خان صاحب کا وسیع بزنس بیرون ملک تک پھیلا ہوا تھا۔ کئی کارخانوں کے مالک تھے۔ شہر میں بہت نام تھا ان کا .... ایک لڑکا رستم اور ایک لڑکی لاڈلی نازوں پلی بیٹی مہرو اور اپنی شریک حیات کے ساتھ عیش کی زندگی بسر کررہے تھے۔

رُستم دسویں جماعت میں زیر تعلیم تھا اور مہرو بی۔اے پاس کر چکی تھی۔

گذشتہ دنوں خان صاحب نے اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ اپنے ایک قریبی دوست کے فرزند ارجمند سے طے کر دیا تھا۔مہرو نے لاکھ انکار کیا مگر اس کی ایک نہ چلی۔

رحمان صاحب خان صاحب کے کافی گہرے دوست تھے۔انکا بھی امپورٹ، ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔رحمان صاحب کی شریک حیات پولیو کا شکار ہو چکی تھی اس لئے وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے جلدی بیٹے کی شادی کرادیں۔سو آج وہ برات لیکر خان صاحب کے گھر آ گئے۔تمام براتی مستی میں جھوم رہے تھے گھر میں ہر سو ہنگامہ بپا تھا۔ ہر طرف نقرئی قہقہے اُبل رہے تھے۔نئ عمر کی الہڑ دوشیزائیں اپنی دلکش آواز سے ماحول کو رومان پرور بنا رہی تھیں۔ کمرے میں ڈھولک ٹھنکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔مہرو کی تمام سہیلیاں رنگ برنگی فیشن ایبل پوشاکوں میں اپنی دلکش داؤں سے نوجوان لڑکوں کا دل ترسا رہی تھیں۔جو بھی نوجوان لڑکا ان کی طرف ایک نظر دیکھ لیتا، آہ بھر کر رہ جاتا۔کچھ لڑکے شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے مہرو کی سہیلیوں سے کہتے۔

''ارے میم صاحب! ایڈرس تو دیتی جاؤ تا کہ ہم بھی برات لیکر آئیں۔سبحان اللہ! کیا بات ہے۔خدا نے اولین فرصت میں اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔'' لڑکیاں بھی انگوٹھا دکھاتے ہوئے پاس سے گذر جاتیں۔

قاضی صاحب نے بیگم کریم خان سے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے کہا: ''محترمہ نکاح کا وقت قریب ہے اپنی دُختر کو لے آیئے۔''

قاضی صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر بیگم کریم خان کو اپنا وقت یاد آ گیا۔ جب وہ دُلہن بنی تھیں وہ شرما گئیں۔ پھر انہوں نے گردن جھٹک دیا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔

بیگم کریم کو آج وقت گذرنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ زینے چڑھ کر اوپر پہنچ گئیں۔ مہرو کے دروازے کے باہر اس کی سہیلی فرح کھڑی تھی۔ بیگم کریم خان کو آتے دیکھ کر بولی: ''چاچی! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود ہی مہرو کو لے کر آتی۔''

بیگم کریم جھنجھلاتی ہوئی تلخ لہجے میں بولی۔ ''آگ لگے اس گھڑی کو آج بھی اس کی رفتار کم نہیں ہوتی۔''

بیگم کریم دروازے کے باہر کسی پہرے دار کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں کہ مہرو کے میک اپ میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ بیچاری ہر آرزو پوری کر لے۔ آخر دلہن ہے۔ کیوں فرح؟ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا تو اپنے آپ کو تنہا پایا ....فرح جا چکی تھی۔ کمرے میں زیورات کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دس منٹ گذر گئے۔ مہرو کمرے سے باہر نہ نکلی تو بیگم کریم غصے سے لال پیلی ہو گئیں۔ انہوں نے زور زور سے آوازیں لگائیں، پر کوئی جواب نہ ملا تو وہ زیرلب بڑبڑائیں۔

"کتنی لاپرواہ ہے یہ مہرو۔ سسرال میں کیا کرے گی۔ اتنی سُست ہے نیچے قاضی صاحب انتظار کر رہے ہیں اور یہ ہے کہ میک اپ ہی نہیں چھوڑتی۔

زیورات کے کھنکنے کی آواز بدستور جاری تھی۔ بیگم کریم پریشانی کے عالم میں دروازہ زور زور سے پیٹنے لگیں۔ انکے ماتھے پر پسینے کو بوندیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگیں۔ آخر تنگ آکر بیگم کریم نے دروازے کو زور سے لات ماری۔ دروازہ ایک دم کُھل گیا ۔ دروازے کے پیچھے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ خالی کمرے میں ٹیپ ریکارڈ چل رہا تھا۔ جس کے اندر سے زیورات کے کھنکنے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ بیگم کریم نے ٹیپ کو نظر انداز کرتے ہوئے پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھا۔ تو وہاں کچھ بھی نہ تھا بدحواسی کے عالم میں انہوں نے کمرے کا تمام سامان ادھر سے ادھر پھینکنا شروع کر دیا۔ اچانک ان کی نظر اس کھڑکی پر پڑی جو پیچھے کے باغ میں کُھلتی تھی۔ ایک لمبی رسی کھڑکی سے نیچے لٹک رہی تھی۔ ان کا شک صحیح نکلا۔ مہرو تمام زیورات لے کر فرار ہو گئی تھی۔ ان کی ٹانگوں سے جان نکل گئی وہ بمشکل دروازے تک پہنچیں۔ ابھی انہوں نے دروازے سے باہر واپسی کے لئے قدم ہی رکھا تھا کہ چلتے ہوئے ٹیپ ریکارڈ سے آواز آئی۔

"ٹھہریئے۔ آپ کے لئے ایک پیغام ہے۔" بیگم کریم غور سے سُننے لگی۔ "ڈیڈی! آج میں نہ صرف آپ کو بلکہ اس گھر کو اس شہر کو چھوڑ کر

آپ سے بہت دور جا رہی ہوں۔ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ عامر بھی ہے۔ میں نے کئی بار آپ سے ذکر کیا لیکن آپ میری باتوں کو مسلسل نظر انداز کرتے رہے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں، کیوں؟ آج سے ہم دور افتادہ مقام پر جا کر آزادی کی زندگی بسر کریں گے۔ مجھے تلاش کرنے سے آپ کا بیش قیمت وقت ضائع ہو جائے گا۔ کیونکہ میں آپ کو کبھی نہیں مل سکوں گی۔ ڈیڈی! آپ نے مجھے دیا ہی کیا ہے؟ آج تک ....؟ بظاہر دنیا والوں کے سامنے سب کچھ لیکن باپ کا وہ پیار جس کی میں ہمیشہ تمنا کرتی رہی، مجھے نہیں ملا۔

مجھے یاد ہے بچپن میں میرے آگے پیچھے کھلونے کے ڈھیر تھے اور اب دولت کے۔ میں اپنی مرضی سے مسکرا نہیں سکتی۔ وہ پیار اور شفقت جس کا مجھے پورا پورا حق تھا میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا............ کیا مجھے جنم دینا ہی آپ کا فرض تھا؟ آپ نے مجھے ہمیشہ خود سے دور رکھا۔ آپ نے کبھی میرے سر پر شفقت سے ہاتھ نہیں پھیرا............ ممی نے بھی کبھی اپنے آنچل میں پناہ نہیں دی............ کتنی بدنصیب ہوں میں۔ ماں کے دودھ سے محروم رہی۔ گائے بھینسوں کا دودھ میری غذا بنی۔ ممی کو مجھ سے زیادہ اپنی سوشل سرگرمیاں اور پارٹیاں پیاری تھیں۔ آپ کو اپنے بزنس سے ہی فرصت نہیں تھی اور پھر آپ نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے میرے جذبات کو باسی پھول کی طرح کچل دیا۔ میرے ارمانوں کا خون کر کے صرف اپنے بزنس کیلئے میرا رشتہ اپنے دوست کے بیٹے سے طے کر دیا جسے

میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں پھر بھلا اس انجان آدمی کے ساتھ یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گذر سکتی تھی۔ جبکہ میں نے اپنے فیصلے سے آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ میری زندگی مین سوائے عامر کے کوئی نہیں آسکتا۔ جب آپ نے آج تک مجھے میرے حقوق سے محروم رکھا تو پھر آج میری زندگی کا اہم فیصلہ کرنے کا حق آپ کو کس نے دیا۔

ڈیڈی! اب میں بالغ ہو چکی ہوں۔ اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ میں جانتی ہوں آپ کو براتیوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ مگر میں کیا کروں، میں مجبور ہوں۔ میں عامر کو کھونا نہیں چاہتی کیونکہ وہ میرا پہلا پیار ہے۔ ڈیڈی! میرے بعد رُستم کا خیال رکھنا۔ اسے خوب پیار دینا میری طرح اس کے ساتھ لاتعلقی مت برتنا ورنہ بڑھاپے کا سہارا کھو بیٹھو گے۔ اس بھری دنیا میں تنہا رہ جائیں گے آپ۔

مجھے امید ہے آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ رُستم کو یہ موقعہ مت دینا کہ وہ بھی بھاگ جائے۔

آپ کی پرائی

مہر النسائ

ٹیپ ریکارڈ سے آواز آنی بند ہو گئی۔ بیگم کریم دروازے سے ٹیک لگا کر ساکت کھڑی تھیں۔ یوں لگا جیسے کسی نے ان کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ انہوں نے آخری مرتبہ ٹیپ ریکارڈ کی طرف دیکھا۔ جواب خاموش تھا اور ان کے ممتا کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ خان صاحب جو نہ جانے کس

وقت سے بیگم کے پاس کھڑے سب کچھ سُن چُکے تھے۔ برات واپس لوٹ گئی۔ وہ شرمسار کھڑے حسرت بھری نظروں سے برات کو دور تک دیکھتے رہے۔ برات ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ خان صاحب بے بس ولاچار کھڑے رہ گئے۔ اب انہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

خان صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ واقعی انہوں نے ہمیشہ دولت کو ہی سب کچھ سمجھا۔ ہمیشہ بچّوں سے لاتعلقی برتی، بچّوں کی خوشی کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا۔ جس اولاد کے لئے اتنی دولت اکٹھی کی۔ جب وہ ہی خوش نہیں تو پھر کیا فائدہ ایسی دولت کا.......... انہیں ڈر تھا کہ کہیں رُستم بھی انہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ وہ دفعتاً اٹھ کر رُستم خان کی خواب گاہ کی طرف گئے۔ سوئے ہوئے رُستم کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس پر کمبل سرکا دی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رستم کو کبھی اپنے سے جدا نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اس کی ہر خوشی کا خیال رکھیں گے۔

وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا.......... خزاں گذر گئی، بہار آئی.......... کلیوں نے چٹکنا شروع کر دیا۔ درختوں پر کونپلیں پھوٹیں۔ رُستم کو اپنے والدین سے بھر پُور پیار مل رہا تھا۔ بیگم کریم اپنے کمرے میں بیٹھی مہرو کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ مہرو کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی؟ آخر ماں کا دل تھا وہ سوچ رہی تھی کہ جو روپیہ اور زیورات جاتے وقت مہرو اپنے ساتھ لے گئی تھی اسے دیکھ کر کہیں عامر کی نیت نہ بدل جائے۔ وہ اپنے تجربے کی بنا پر ایسا سوچ رہی تھی پھر وہ سر کو جھٹک کر خود ہی ہنس پڑی۔ مہرو خوش

رہے۔ اسی میں ہماری خوشی ہے بجلی کڑ کنے سے ان کی سوچ منتشر ہوگئی۔ وہ جلدی جلدی اٹھیں اور کھڑکیوں کے پردے درست کرنے لگیں۔

بجلی ایک بار پھر کڑکی۔ بیگم کریم کو لگا جیسے نزدیک کوئی بم پھٹا ہو بیگم کریم نے زور زور سے کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر زور کی بارش ہو گئی۔ بھادوں کی کالی اندھیری رات .... اس پر بجلی کا بار بار کڑکنا. بادلوں کا گرجنا اور تیز بارش۔ بیگم کریم کا دل انجانے خوف سے گھبرا رہا تھا۔ بارش تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی، یوں لگ رہا تھا، جیسے قیامت آ گئی ہو۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ بیگم کریم چونک پڑیں اور سوچنے لگیں آدھی رات کو کون ہو سکتا ہے۔ ان کی نظر دیوار پر لگے ہوئے گھڑیال پر پڑی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ انہوں نے خان صاحب اور رُستم کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ تمام نوکر اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دستک پھر ہوئی۔ بیگم کریم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دستک اور تیز ہوگئی کافی سوچ وچار کے بعد انہوں نے دروازہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی دروازے تک پہنچی .... ہاتھ آگے بڑھا کر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک تنہا لڑکی کو دیکھ کر انکی چیخ نکل گئی۔ بیگم کریم اسے ایک ٹک دیکھتی رہیں جیسے وہ لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

اچانک بیگم کریم کے منہ سے نکلا "مہرو" میری بچی تو واپس آگئی اور فوراً اسے گلے سے لگا لیا۔ .... ☆☆☆ ....

گھونسلے

گزشتہ دو روز سے برف باری ہو رہی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی سارا علاقہ جیسے پشمینے کے سفید شال میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ درختوں کی شاخیں برف کے بار سے ایسے سرنگوں تھیں جیسے زمین کو سلام بجالا رہی ہوں۔ مکان کی چھتوں پر جمع ہوئی برف کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے دُھنی ہوئی روئی کے ڈھیر لگا دیئے ہوں۔

رسوئی کی بخاری سے نکلنے والے دھوییں کی موٹی لکیر خلاء میں تحلیل ہو رہی تھی اُس کے مکان کے چھجے پر جمی ہوئی برف اس کے سر کا تاج لگ رہی تھی۔

اس ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں آدم زاد تو اپنے گھروں میں بیٹھ کر اپنے اجسام کو حرارت پہنچانے کا اہتمام کر رہے تھے لیکن بے زبان پرندے دانے کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ وہ کونوں کھدُروں سے دانہ

چُگ چُگ کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اُن کی چہچہاہٹ کانوں میں مدھر رس گھول رہی تھی، کہ یکا یک یہ چہچہاہٹ کرخت ہو گئی اور کچھ چڑیوں نے ادھر اُدھر اُڑنا شروع کر یا، پھر چڑیوں کی چہچہاہٹ اچانک شور میں تبدیل ہو گئی، یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں کسی آنے والے خطرے کا پیشگی احساس ہو گیا تھا۔ اُن کی چہچہاہٹ میں شدت آ گئی۔ شدت بھی ایسی کہ ہر ذی شعور کو اپنی جانب متوجہ کر سکے،،

اب تو چڑیوں کے جُھنڈ کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ جنگلی بلّی ایک بار پھر اُن پر حملے کی تیاری کر رہی ہے۔

یہ وہی بلّی تھی جس نے گزشتہ دو دنوں میں ان پر جھپٹ کر چار چڑیوں کو اپنا نوالا بنا لیا تھا اور اب پھر موقعے کی تلاش میں تھی،

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس ٹھٹھرتی سردی میں حُقے کے گرم گرم کش لگانے میں مصروف تھا، بیچ بیچ میں سے نظریں اُٹھا کر برف باری سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا،،

حسب معمول آج بھی اُس نے چھجے کے نیچے آنگن میں گندم اور چاول کے دانے اس غرض سے ڈال رکھے تھے تا کہ اس برف باری میں پرندے اپنے پیٹ کی آگ کو بجھا سکیں،،

حُقے کی نے دانتوں تلے دبائے وہ سوچ رہا تھا کہ آج تک اس جنگلی بلّی نے کتنے ہی پرندوں کا شکار کر کے کئی گھونسلے اجاڑ دیئے لیکن پھر

بھی اُس کی تشفی نہیں ہوئی۔ اگر اسی طرح روزانہ یہ جنگلی بلّی ان پرندوں کا شکار کرتی رہی تو بہار میں درختوں اور مُنڈیروں پر کون سُریلے نغمے گا کر اپنی چہچہاہٹ سے اس علاقے کو رونق بخشے گا؟..........

یہ نہ ہو کہ گھونسلوں میں بیٹھے ان کے بچّے اپنی ننّھی ننّھی چونچیں کھول کر غذا کا انتظار کرتے رہیں..........

ایک لمبی آہ بھر کر اُس نے حقّے کا ایک لمبا کش لگا کر دھواں ہوا میں چھوڑ دیا۔ دھواں پھیلتے پھیلتے چڑیوں کے جُھنڈ تک پہنچ گیا۔ دھواں اتنا گھنا تھا کہ چڑیوں کا جُھنڈ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی،، اُس نے ایسا دھواں ایک ملٹری اوپریشن کے دوران دیکھا تھا۔ جو انہوں نے بندوق برداروں کے خلاف اس علاقے میں کیا تھا اور اُس دھوئیں میں کئی بے خطا پرندوں کا دم گُھٹ گیا تھا۔

بے قراری کے عالم میں اُس نے جلدی جلدی اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے دھوئیں کو ہٹا کر اپنی آنکھوں پر نظر کی عینک چڑھائی تو اب چڑیوں کا جُھنڈ اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا..........اُس نے اطمینان کا سانس لیا..........،،

اُس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو برف لگاتار گر رہی تھی۔ موٹے شیشوں والی عینک کے اندر سے گرنے والی برف اُسے روئی کے گالوں کی طرح لگ رہی تھی، گردن پھیرنے پر دفعتاً اس کی نظر اُس جنگلی بلّی پر پڑی جو چھجے کے نیچے رکھے ہوئے شہتیروں کی آڑ میں ہولے ہولے

چڑیوں کے جھنڈ کی جانب اپنے قدم بڑھا رہی تھیں۔ اُس نے غور سے دیکھا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے،، یہ کیا؟ اس جنگلی بلّی کے پیچھے چھوٹی چھوٹی بلیّاں قطار میں آگے بڑھ رہی تھیں اُس نے کنکھیوں سے شمار کیا تو اسی کے قریب چڑیاں اور آٹھ بلیّاں تھیں،، نہیں............ یہ ظُلم ہے ....سرا سر ظُلم ....! میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا، اُس کا خون کھول اٹھا، حُقہ ایک طرف رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ کمرے کے کونوں میں کچھ تلاش کرنے لگا جلدی ہی اُس کی نگاہیں ایک چیز پر جم گئیں،، یہ گھاس اکھٹی کرنے والا ''جندرا'' تھا ....،، اب دیکھتا ہوں یہ اپنے ناپاک ارادے میں کیسے کامیاب ہو پاتی ہیں؟

''جندرا'' اٹھا کر وہ دروازے کے پٹ کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اس نے وہ ''جندرا'' بلیّوں پر دے مارا، ایک بلّی تو موقعے پر ہی ڈھیر ہو گئی اور باقی وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئیں۔ چڑیوں کا غول اُڑان بھر کر دوسرے مکان کی مُنڈیر پر جا بیٹھا،،

مری ہوئی بلّی کو دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا جیسے اُس نے کسی شیر کا شکار کیا تھا۔

''جندرا'' سنبھال کر وہ پھر کھڑکی کے پاس بلیّوں کی تاک میں بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا،، ان کالی اور سفیدں کا ملاپ کیسے ہو گیا۔ چند مہینے قبل تو وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھیں، اُس نے سر جھٹکا،، چلو اُس کی ایک کوشش سے کتنی جانیں بچ گئیں۔ کاش اُس نے پہلے سے ایسی کوشش کی

ہوتی تو اس وقت تک کئی گھونسلے اُجڑنے سے بچ گئے ہوتے،،

چہچہاہٹ سُن کر اُس کو لگا جیسے چڑیاں اُس کا شکریہ ادا کر رہی ہوں ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر بکھر گئی،،

ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، پرندوں کو ڈالا ہوا دانہ بھی اب ختم ہو چکا تھا۔ پرندے ایک ایک کر کے اپنے گھونسلوں کی راہ لے رہے تھے،، دور سے موذن کی اذان دینداروں کو عبادت کی دعوت دے رہی تھی، برف باری میں قدرے کمی آ چکی تھی،،

اس نے حُقے کا آخری کش لگا کر دھواں کھڑکی سے باہر چھوڑ دیا پھر اُس دھویں کو غور سے دیکھنے لگا۔ دھواں ایک لمبی لکیر کی صورت اختیار کر کے دلاور خان کے بنگلے کی طرف چلا گیا اور اُس کے پیچھے پیچھے اُس کا ذہن بھی دلاور خان کے بنگلے کے دُروں چلا گیا،، جس کے چھجے کے نیچے کبھی بے شمار پرندوں کے گھونسلے ہوا کرتے تھے۔ خوشیاں اس بنگلے کا طواف کرتی تھیں اور آنگن میں سُکھ کی بانسری بجتی تھی۔ پورے پانچ کنال پر پھیلا ہوا ایسا شاندار بنگلہ سارے علاقے میں کسی کا نہیں تھا۔ بے شمار دولت ہونے کی وجہ سے ہر حاجت مند کی مُراد پوری ہوتی تھی۔ رحمدل اور خدا پرست سخی سے کسی کا دکھ نہیں سہا جاتا تھا۔ پورے چالیس افراد کا کنبہ تھا، پھر جب چند بلّیوں سے اس گھر کی خوشحالی برداشت نہ ہوئی تو انھوں نے جنگلی بلّیوں سے ساز باز کر کے اس گھرانے کی خوشیوں کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تو اس بنگلے میں پناہ لینے والے کچھ پرندوں نے ہجرت کو ترجیح دی تو کچھ کا

گھونسلوں کے اندر ہی دم گھٹ گیا۔

اس نے سر کو جھٹک کر اپنا ذہن دلاور خان کے بنگلے سے آزاد کیا تو اُس کی نظر برف پر پڑے ہوئے بلیّوں کے پیروں کے ان نشانات پر جم گئی جو دلاور خان کے بنگلے سے چلتے ہوئے اُس کے مکان کی جانب بڑھ رہے تھے،، "جندرا" ہاتھ میں اُٹھا کر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

نہیں..........! میں اُن کو ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دونگا،،

..........☆☆☆..........

آس بھرے دونیناں

وہ آنکھیں جن کا میں گرویدہ تھا۔ وہ سحر انگیز آنکھیں جن کی خاطر میں نے اپنے گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ وہ کاجل بھری آنکھیں جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں۔ وہ مدبھری آنکھیں دیکھ کر کسی پر بھی نشہ طاری ہو جاتا۔ وہ خوبصورت آنکھیں جو سارے شہر کی دید کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ آج مجھ سے دور کوسوں دور ہو گئیں ہیں..........

میں جب بھی شام گئے اپنے کمرے میں داخل ہوتا ہوں تو سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی اس کی تصویر میں سے دو آنکھیں میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ کبھی حسرت سے تو کبھی محبت سے، کبھی خوشی سے تو کبھی غم سے...... وہ مجھے اس طرح گھورتی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں، ان دو روحوں کو جنھوں نے کبھی نہ بچھڑنے کا عہد کیا تھا، بچھڑے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ آج میرا درد جاننے والا یہاں کوئی نہیں.......... سب کچھ پا کر بھی میں نے کچھ

نہیں پایا۔ اپنوں میں ہوتے ہوئے بھی میں تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔ کیونکہ تم جو میرے قریب نہیں...... مانا اس وقت میرے پاس سب کچھ ہے لیکن تمہارے بغیر یہ عیش و آرام کس کام کے؟ تمہاری یادیں ہی آج میری چند سانسیں ہیں، تمہاری غیر موجودگی میں مجھے معلوم ہوا کہ یادیں کسی خزینے سے کم نہیں ہوتیں۔ ننھی درخشاں، جس کی توتلی باتیں سُننے کے لئے تم ہمیشہ بے قرار رہتے تھے، ہر شام سوتے وقت مجھ سے پوچھتی ہے ''امّی! ابو جان کب آئیں گے؟ اُسے قریب سے دیکھنے کا کیا تمہارا دل نہیں کرتا؟ اس کی ندا ضرور تمہارے کانوں میں بازگشت کرتی ہوگی۔

ابو جان! میرے لئے وہ بڑی والی گڑیا لانا جس کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی ہیں۔ وہ آنکھیں سوالات کی بوچھاڑ کر رہی ہیں مجھ پر۔ لیکن میں کیا کروں؟ وقت کے ہاتھوں بے بس ہوں، میری پیشانی پر حکومتِ وقت کے کارندوں نے سرکاری مہر ثبت کر دی ہے۔ میری جوانی کے یہ قیمتی لمحات وقت کے ہاتھوں قسطوں میں بک رہے ہیں۔ آخر میں بھی انسان ہوں! میرے سینے میں بھی ایک حساس دل ہے۔ جس میں ہزاروں جذبات قفس میں قید پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہے ہیں...... میں اس کی روح کی پکار صاف سن رہا ہوں جو سیدھی اس کے دل سے اُٹھ رہی ہے۔ اس کی پیاری پیاری آنکھوں میں جدائی کے قطرے محسوس کر رہا ہوں لیکن سب کچھ جان کر بھی انجان بنا بیٹھا ہوں۔ اوروں کی طرح اگر میں بھی داستانِ ہجر اپنی زبان پر لانے لگوں یو یقیناً میں اس شہر میں ایک دن بھی نہ

گزار سکوں۔ حالانکہ یہ شہر میرا اپنا ہے۔ اس شہر کے لوگ میرے اپنے ہیں۔ یقیناً سب کے دلوں میں میرے لئے بے پناہ عزت اور محبت ہے۔ لیکن میں نے اپنے لب سی رکھے ہیں کیونکہ میرے دل کے درد کو صرف وہی سمجھ سکتی ہے اور کوئی نہیں۔ باقی (ہنستا ہوا چہرہ تو یہ دنیا کے لئے ہے) تنہائی میں جب میں اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو خدا قسم کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سوچتا ہوں! کیا تھا؟ کیا بنا؟ اور اب کیا ہو گیا۔ ایک خوشحال گھر دو شہروں میں بٹ گیا۔ ایک ہنستا ہوا کنبہ ٹوٹی ہوئی مالا کی طرح بکھر کر رہ گیا۔ دو روحیں دو شہروں میں تنہا ایکدوسرے کو ملنے کے لئے ترس رہی ہیں۔ مگر کسی کو اس سے کیا؟ وقت کا پہیہ کبھی کسی کے لئے نہیں رُکتا.......... یہ قافلہ آج بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے...... احباب، رشتے، عزیز واقارب، سب وقتی بندھن ہیں۔ مستقل رشتہ تو بس ایک ہی ہے "دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا" سنا ضرور تھا۔ لیکن اب اس بات کا تجربہ بھی ہو گیا۔ کیونکہ وہ بطن جس سے میں نے جنم لیا، وہ آغوش جس میں میں نے پرورش پائی وہ ہاتھ جن کی انگلی پکڑ کر میں نے اپنے ننھے پیروں پر چلنا سیکھا۔ آج اس بطن کے لئے میں ایک اجنبی ہوں۔ آج وہ آغوش میرے لئے پرائی ہو گئی ہے.......... آج وہی انگلی میرے عزت پر اٹھ رہی ہے۔ جن کاندھوں پر بوجھ ڈھو کر میں نے اس مکان کی بنیاد رکھی۔ ان ننھے ہاتھوں سے تنکے چُن چُن کر اپنے کُنبے کے افراد کے لئے سر چھپانے کی جگہ بنائی۔ آج اس پر میرا کوئی حق نہیں؟ جس کنبے کی پرورش کی خاطر میں نے چپراسی

کی معمولی سی نوکری پر قناعت کر لی، آج میرا وجود ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا.........جن بے جان بتوں کو میں نے زبان عطا کی آج وہ مجھ پر ہی برس رہے ہیں۔......لوگ بے چارے کیا جانیں کہ سچائی کیا ہے؟ وہ تو بس اشکوں کے چند قطرے دیکھ کر یقین کر لیتے ہیں کہ حقیقت یہی ہے...... تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کی کسی نے بھی ضرورت محسوس نہیں کی......آج میرے اپنے ہی سارے شہر میں میرے خلاف زہر اُگل رہے ہیں۔ تاکہ اس بدنامی سے تنگ آ کر میں یہ شہر ہی چھوڑ دوں۔ کیوں؟ کیا یہی قصور ہے میرا کہ میں نے اپنی شریک حیات کا انتخاب اپنی مرضی سے کیا؟

اور وہ بھی ایسی شریک حیات جس نے میری زندگی کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا......جس نے مجھ مفلس کے لئے شان وشوکت بھری زندگی کو ٹھوکر ماردی۔ جس نے عالیشان حویلی چھوڑ کر معمولی سی جھونپڑی قبول کی ...... ہر انسان کو اپنی مرضی کی زندگی جینے کا حق حاصل ہے۔ پھر میں نے کون سا گناہ کیا تھا؟ کیا میں ان کے غلط فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ جہیز کے لالچ میں وہ جسے چاہتے میرے گلے باندھ دیتے تاکہ جہیز میں آنے والے سامان سے وہ اپنے مکان کے کمروں کی سجاوٹ کر سکتے؟ انہیں کیا؟ نبھانا تو مجھے تھا۔ ازدواجی زندگی تو مجھے بسر کرنی تھی۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل نہ کر کے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ مجھے ایک ایک لمحہ آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب اس نے میرے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو جیسے اجڑے ہوئے ویرانے میں بہار آ گئی تھی۔ میرے آنگن

میں خوشیاں رقص کرنے لگی تھیں...... جذبات کی کلیاں مہکنے لگیں تھیں............ اس نے چند ہی دنوں میں گھر کے ہر فرد کو جینے کے آداب سکھا دیئے تھے۔ گھر کی عزت کو دوبالا کیا تھا۔ برہنہ سروں کو حیاء کی چادر عطا کی تھی۔ ٹوٹے ہوئے تمام رشتوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا تمام پڑوسیوں کی دل جیت لئے تھے لیکن اس کا انعام اسے کیا ملا؟ جدائی۔ فقط جدائی...... جیسے ایک مچھلی کو ندی سے جدا کر دیا جائے...... جیسے ایک پھول کو ٹہنی سے جدا کر دیا جائے...... جیسے ایک پنچھی کو اس کے آشیانے سے دور کر دیا جائے...... چلو وہ لوگ خوش رہیں جنہوں نے یہ کام انجام دیا تھا۔ دو محبت بھرے دلوں کو جدا کر دیا تھا...... آخری بار جب میں نے اپنی شریک حیات کو دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں درد کی ایک جھیل جھلملا رہی تھی جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو "بس! جا رہے ہو؟...... تم نے تو زندگی بھر نہ بچھڑنے کا وعدہ کیا تھا...... تم نے تو ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں، بھول گئے وہ وعدے؟ وہ قسمیں؟ لیکن اپنے قریب اس آٹو ڈرائیور کو دیکھ کر (جو مجھے بس اڈے تک لے جانے آیا تھا) اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ صرف آنسوؤں کے دو گرم گرم قطرے اس کے سیب جیسے سرخ رخساروں پر پھسل گئے۔ پھر ایک طائرانہ نظر میں نے ننھی درخشاں پر ڈالی، نیند سے بوجھل آنکھیں لئے مسکرا رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ شاید یہی کہ ابو! لوٹ کر ...... گے؟ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ اس سے قبل کہ صبر کا دامن میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا۔ میں نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا

''رہی زندگی تو پھر ملیں گے'' خدا حافظ۔ پھر دو اُداس آنکھیں گلی کی نکڑ تک میرا تعاقب کرتی رہیں...... میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ دو آنکھیں آج بھی مسلسل میرا تعاقب کر رہی ہیں اور سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ سب کچھ۔ یہ بھی کہ میں نے دیر سے کمرے میں نہ آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آج پھر...... ! کاش دیوار پر لگی ہوئی اس کی تصویر مجھ سے باتیں کر سکتی تو میں اسے بتاتا کہ اتنے بڑے کمرے میں ایک تنہا شخص جلدی آکر بھلا کرے بھی کیا؟ اس کمرے کی دیواریں تو کاٹنے کو آتی ہیں۔ مجھ سے سوالات کرتی ہیں کہ کہاں چھوڑ آئے اُسے؟ جو ہر روز ہم پر سے جالے ہٹا کر گرد جھاڑتی تھی؟ رحل پر رکھا ہوا وہ قرآن پاک جسے وہ ہر روز صبح اپنے نازک ہاتھوں سے بعد از نماز پڑھ کر آنکھوں سے لگاتی اور میرے حق میں ڈھیر ساری دعائیں مانگتی تھی۔ لیکن آج میں کس کس کے سوال کا جواب دوں؟ کس کس کو بتاؤں کہ اس جدائی کا سبب وہ کوکھ ہے جس نے مجھ بدنصیب کو جنم دیا۔ کاش اس نے پیدائش کے وقت میرا گلا گھونٹ دیا ہوتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔ میں کہیں...... میری معصوم رفیقہ حیات اور وہ پھول سی بیٹی کہیں...... میرے پیار اور میری شفقت سے محروم۔

میں آج اُن آنکھوں سے لاکھوں میل دور روزی کمانے کے چکر میں مصروف ہوں جنہیں میں پیار سے چُوم لیتا تھا۔ ان آنکھوں سے اوجھل جن میں کاجل لگانے کی فرمائش کرتا تھا۔ جن کی تعریف میں ڈھیر سارے شعر کہہ ڈالتا تھا اور وہ شرما کر بس اتنا کہتی ''چلو ہٹو! اور کوئی کام

نہیں ہے آپ کو؟'' شاعر ہوتے ہی دیوانے ہیں! آج بھی سب کچھ اپنی جگہ پر ہے۔ یہ زمین...... یہ آسمان...... یہ شہر...... یہ گھر...... یہ کمرہ...... کمرے میں رکھا ہوا سامان...... یہ لوگ جو صرف مطلب پرست ہیں۔ مگر وہ نہیں ہے جس کے رہتے ہوئے میرا یہ چھوٹا سا جھونپڑا بھی میرے لئے کسی جنت سے کم نہیں تھا...... وہ آنکھیں تصویر میں سے آج بھی مجھے گھور رہی ہیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں'' کتنے سنگ دل ہو تم! جب سے گئے ہو ایک بھی خط نہیں لکھا...... اور کب تک تڑپاؤ گے؟ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے بغیر میں ادھوری ہوں۔ بالکل بے جان جسم کی طرح...... کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف اپنی شوہر سے کی جاتی ہیں۔ جب بھی گھر سے باہر قدم رکھتی ہوں تو پرائے مردوں کی نگاہیں نشتر بن کر میرے جسم پر چھبتی ہیں۔ اب سب میرے برداشت سے باہر ہو گیا ہے! میری آنکھیں تمہارے انتظار میں تھک گئی ہیں...... یوں لگ رہا ہے کہ جیسے وہ تصویر آج مجھ پر گر کر ہی رہے گی...... نہیں نہیں...... یہ تصویر ہی تو میرے جینے کا سہارا ہے ...... میری تنہائی کی ساتھی...... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بادام جیسی آنکھیں میرے انتظار میں پتھرا کر اپنی بے پناہ محبت کا احساس دلا جائیں اور میں کہیں کا نہ رہوں......

..........☆☆☆..........

فساد

جون کا گرم مہینہ...... تپتی دوپہر............ سُنسان گلیاں............
شہر کے سارے لوگ گرم لُو سے بچنے کے لئے اپنے اپنے کنکریٹ مکانوں میں پنکھوں اور اے سی کی ہوا سے اپنے اجسام کو ٹھنڈک پہنچانے میں مصروف تھے کہ دفعتاً اُن کے کان بج اُٹھے۔ باہر گلی میں کافی شور مچا ہوا تھا۔ چند مکینوں نے اپنے اپنے مکانوں کی کھڑکیوں سے باہر جھانکا تو اُن کا شک صحیح نکلا، آج پھر شانتی اور شکیلہ میں جھگڑا جاری تھا،،،،

خدا کرے تمہارے بیٹے کے ہاتھ ٹوٹ جائیں، جن ہاتھوں سے اُس نے ہمارے درخت کی ٹہنیاں کاٹیں، شکیلہ آسمان کی طرف آنچل اٹھا کر بددعائیں دے رہی تھی،،،،

جواب میں شانتی نے کہا، میرے بیٹے کی بلائی لگ!
اُس کی بلائی لگیں گے کالے کتے! اور میرا جوتا ....،،

جوتا لگے تمہارے منہ پر!

منہ تو تمہارا جوتے کے لائق ہے!

ہاں ہا تو تو جیسے چاند کا ٹکڑا ہے نا ....؟

کالی کلوٹی......بھوتنی......جنگلی......گنوار کہیں کی......''

تمہارا بس چلے تو اس شہر کو بھی درخت لگا لگا کر جنگل بنا دے!

شانتی جل بھن کر بولی،،

ہاں ہاں تمہیں تو جنگلوں سے انت کا بیر ہے، تبھی تو تمہارے شوہر نے تمام جنگل کاٹ کاٹ کر بیچ ڈالے!

یہ تو اپنی اپنی ہمت ہے، شانتی فخریہ انداز میں بولی،،

اپنا خیال رکھنا کہیں تمہیں نہ بیچ ڈالے!

بیچے اپنی ماں کو ....اپنی بہن کو، بکواس کرتی ہے! کہتے ہوئے شکیلہ نے ایک پتھر اُٹھا کر شانتی کی طرف پھینکا، نشانہ چوک کر پتھر سڑک پر چل رہے کالونی کے ایک بزرگ سردار کرپال سنگھ کے پیروں میں جا گرا۔ پتھر دیکھ کر کرپال سنگھ نے اُن سے کہا، کیا ہو گیا ہے آپ دونوں کو؟ سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کو اس تپتی دھوپ میں بھی آرام نہیں؟ آپ دونوں کے روز روز کے جھگڑے سے ساری کالونی تنگ آ چکی ہے،، آج کیا ہوا؟ جھگڑا کس بات پر ہے؟ سردار جی اندر آئیے! یہ دیکھئے درخت کی حالت،، اس پنڈ تانی کے بیٹے

نے ناشپاتی کے درخت کی لمبی لمبی ٹہنیاں کاٹ کر درخت بیکار کر دیا ہے۔

سردار جی! یہ دیکھو اس جنگلی عورت نے ہمارے مکان کے ارد گرد ناشپاتی، انار، اور انگور کی بیل لگا کر پورا جنگل بنا دیا ہے، ٹہنیاں نہ کاٹیں تو کیا کریں؟ سبھی کمروں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے ....،، دونوں کی باتیں سن کر کرپال سنگھ کہنے لگے، ویسے تو اپنی چہار دیواری کے اندر کوئی کچھ کرے لیکن اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ ہماری وجہ سے پڑوسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، خیر یہ مسئلہ ایسے حل نہیں ہوگا، کل صبح تم دونوں اپنے اپنے شوہروں کو میرے پاس بھیج دینا وہیں بات کریں گے،، پھر دونوں ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کے اندر چلی گئیں..........،،

سریندر محکمہ جنگلات میں افسر تھا اور تھوڑے ہی وقت میں اُس نے کافی ساری دولت سمیٹ کر شہر کی پاش کالونی میں ایک شاندار کوٹھی تعمیر کر لی تھی اور اس کی بیوی شانتی شوہر کی افسری کا رعب اکثر غریبوں پر جماتی رہتی..........،،

دلاور نے اپنے آبائی گاؤں کی ساری زمین بیچ کر اس کالونی میں دس مرلے کا ایک پلاٹ خرید کر اس غرض سے ایک چھوٹا مگر پختہ مکان بنا لیا تھا تاکہ وہ ہوٹل چلانے کے ساتھ ساتھ دونوں بچّوں کو انگلش میڈیم اسکول میں اعلیٰ تعلیم دلا کر وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کر سکے، پھر اسے اپنے نہ پڑھنے کا بھی بے حد افسوس تھا، اپنے بچوں کو پڑھا کر وہ اپنے دل کا یہ

ارمان پورا کرنا چاہتا تھا ورنہ گاؤں کا وہ ماحول جہاں قدرت کے نزدیک رہ کر وہ بہت خوش تھا۔ چھوڑنے کے لئے وہ کب تیار تھا۔ مگر ان دس برسوں میں وہ شہر کی کالونیوں میں بسنے والے لوگوں سے اس قادر بدظن ہو چکا تھا کہ کہنے کی بات نہیں..........،، نہ ایک دوسرے کے گھر جاتا..........نہ کوئی کسی کی خوشی غمی میں شریک ہوتا.......... پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں..........تھوک تک خریدنی پڑتی.......... یہاں تک کہ مردے کے لئے قبرستان بھی خریدنا پڑتا..........،،وہ پھر گاؤں چلا جاتا پر گاؤں والے تو اسے اب شہر والوں کے کھاتے میں ڈالتے تھے اور شہر والے آج بھی اسے گنوار دیہاتی کہتے تھے ....اپنے گاؤں کی مٹی سے رشتہ توڑنے کا اُسے یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ اپنے آبائی گاؤں کے ریونیو ریکارڈ سے اُس کا چُولہا بھی کاٹ دیا گیا ......،،

شام کو جس وقت دلاور بچّوں کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے بیٹھا تو بک بک کرنے والی شکیلہ کو چُپ دیکھ کر حیران سا ہوا،

شکیلہ نے پلیٹ زور سے فرش پر پٹخی تو ٹک کی آواز سے دلاور چونک پڑا ....،،کیا بات ہے؟ آج ہمارے گلاب کا چہرہ خاروں سے کیوں اٹا ہوا ہے؟ دلاور نے شکیلہ کی کلائی پکڑتے ہوئے پوچھا، شکیلہ ہوں کر کے کلائی چھڑاتے ہوئے بولی،،آپ سے کہا تھا کہ ان کافروں کے گڑھ میں مکان مت بناؤ۔ مگر آپ نے میری ایک نہ مانی۔ چاروں جانب سے ہندوؤں کے گھر ہیں، ہر وقت جان مٹھی میں رہتی ہے..........،،اچھا اب

کیا ہوا؟ ہونا کیا تھا، آج پھر شانتی نے زبردست جھگڑا کیا، کلہاڑی لے کر مارنے کے لئے آئی،، شکیلہ نے آنسوؤں کی جھڑی لگاتے ہوئے کہا.........،، ہاں پاپا وہ تو ہمیں مار ہی ڈالتی اگر عین وقت کرپال چاچا نہ پہنچتے.........،، دونوں بچّوں نے ماں کی وکالت کرتے ہوئے کہا،،

آپ تو دن بھر گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ پیچھے کوئی ہمیں مار کاٹ ڈالے تو کون پوچھے گا؟ یہ سب باتیں سن کر دلاور جذباتی ہو گیا،، وہ آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا،، کس کی مجال ہے جو میرے عیال پر ہاتھ اُٹھائے؟ میں اس کے ہاتھ نہ کاٹ ڈالوں۔ آپ ہر بار یہی بات کہتے ہیں پر کرتے کچھ بھی نہیں ....،، شکیلہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی،، تو چُپ کر ....صبح ہونے دے پھر دیکھ میں پنڈت کو کیسا مزا چکھاتا ہوں۔ یہ سُن کر شکیلہ کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ....،،

ادھر ابھی سریندر نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ شانتی نے اُسے پانی پت کی ساری داستان سنا ڈالی،، سُریندر بیچارا صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا،، مرد بیچارہ دن بھر کا تھکا ماندا گھر آتا ہے۔ یہاں تم عورتیں اس کا دماغ خراب کر دیتی ہو۔ اب کیا میں اسی وقت اسے گھر جا کر مار ڈالوں؟ شکیلہ نے تم سے جو کچھ کہا وہ اس کی جاہلیت ہے۔ پر تو تو افسر کی بیوی ہے۔ پڑھی لکھی سمجھدار ....،، اس کالونی میں تو مسلمانوں کے گنے چنے گھر ہیں پھر تجھے ان سے خطرہ کیوں محسوس ہونے لگا؟ دیکھو یہ تمہارا وہم ہے! کوئی بھی مذہب بُرا نہیں ہوتا۔ بُرے ہوتے ہیں وہ لوگ جو

اپنے کرتوتوں سے مذہب کو بدنام کرتے ہیں، سریندر نے جوتے کے فیتے کھولتے ہوئے کہا،،

ہاں ہاں آپ تو ہمیشہ ہی اہنسا کا پاٹھ سناتے ہو! لیکن آج وہ زمانہ نہیں کہ کوئی ایک طمانچہ مارے تو تم اپنا دوسرا گال پیش کر دو............ اگر آپ نے یہی رویہ اپنا رکھا تو ایرے غیرے نتھو خیرے سر چڑھ جائیں گے، کہہ کر شانتی رسوئی کی طرف چل دی............،،

صبح کرپال سنگھ نے دونوں کو اپنے گھر سے سمجھا کر روانہ کیا تو باہر نکلتے ہی وہ پھر بحث کرنے لگے۔ دونوں کے درمیان زبردست تلخ کلامی ہوئی۔ دلاور نے اپنی جاہلیت کا بھرپور مظاہرہ کیا پر سریندر نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے صبر سے کام لیا ورنہ بات بڑھ جاتی............

الگ ہوتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کو اس طرح گھور رہے تھے جس طرح بلّی چوہے کو اور شیر ہرن کو............،، اس کے بعد بھی کئی مرتبہ دونوں گھروں کے درمیان جھگڑے ہوتے رہے اور دونوں اطراف سے گالیوں کے تیر برستے رہے۔ دلاور اور شکیلہ کے رویے کو دیکھ کر کالونی کے سارے لوگ اُن کے خلاف ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دلاور اپنا مکان بیچنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اسے لگا کہ دوسرے فرقے کے لوگ اُن کے خلاف صف آرا ہو چکے ہیں اُس کے دل میں یہ خوف بھی گھر کر گیا تھا کہ یہ لوگ کسی وقت بھی اِسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ وہ اپنا سورگ جیسا گاؤں چھوڑ کر اس جہنم میں کیوں آیا تھا............،،

وہ خوبصورت گاؤں.........گاؤں کے لوگ.........اُن کی مشری جیسی باتیں.........اُن کا اخلاق.........اُن کا پیار، محبت اور ہمدردی.........وہاں کا بھائی چارہ.........وہاں کی برادری یاد آتے ہی اس کی آنکھوں میں اشکوں کے قطرے جھلملانے لگتے ....،، وقت ریت کی مانند مٹھی سے پھسلتا رہا۔ اس دوران بہت سے لوگ دلاور کا مکان دیکھنے آئے پر مناسب قیمت کوئی نہ دے سکا.........،،

اسی اثناء میں وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ سیاست کی لُو سے شہر کا سارا ماحول کچھ زیادہ ہی گرم ہوگیا۔ دھرتی پر تعصب کے بیج پھوٹنے لگے۔ شیریں دہن مکھڑوں سے نفرت کا زہر بہنے لگا۔ گاندھی ٹوپی والوں نے اس موقعے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس تندور پر ووٹوں کی روٹیاں سینکناں شروع کر دیں۔ دونوں فرقوں کے لیڈروں نے اپنی اپنی تقاریر سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ سیدھے سادھے لوگ اُن کے ہاتھوں کے کھلونے بن گئے۔ شہر میں فرقہ درانہ فسادات شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں سوڈا واٹر کی بوتلوں اور پتھروں کی بارش شروع ہو گئی ....،، لاٹھیاں، کلہاڑیاں، ترشول، نیزے اور برچھیاں ہر قسم کے ہتھیار مارکیٹ میں آ گئے۔ چند سر پھرے لوگوں نے صدیوں کے بھائی چارے کی چادر کو تار تار کر دیا۔ لوٹ مار کے بعد ذاتی دشمنی نکالنے کی غرض سے کئی دکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ آگ کی لپٹیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ نفرت کے دھویں سے محبت کا آسمان سیاہ ہو چکا تھا۔

شہر کی سڑکیں انسانی خون سے سرخ ہو چکی تھیں،،، فسادیوں نے حیوانیت کی ساری سرحدیں توڑ ڈالیں تھیں۔ ہزاروں انسان حیوانیت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے، جگہ جگہ چیلیں اور گدھ انسانی لاشوں پر بیٹھ کر بین کر رہے تھے۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ جس کو بھی موقعہ ملتا اپنے ہاتھ آزمالیتا۔ تمام شہر میں مواصلاتی نظام ٹھپ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے محلے میں ہندو ڈرے ہوئے تھے اور ہندوؤں کی بستی میں مسلمان خوفزدہ تھے۔ بھروسے اور اعتماد کی ساری دیواریں گر چکی تھیں، جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو انتظامیہ کو تمام شہر میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ فسادیوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم تھا۔ اس کے باوجود دونوں فرقوں کے چند لوگ ٹولیوں کی شکل میں سیکورٹی اہلکاروں سے بچتے بچاتے ایک دوسرے کی املاک کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ ایک رات تو جیسے تیسے گزر گئی۔ دوسرے دن سہہ پہر کے وقت ایک گھنٹے کی ڈھیل کے دوران تشدد پھر بھڑک اٹھا۔ دونوں اطراف سے کچھ اموات ہوئیں۔ اب یہ کھیل سیاسی لوگوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے شہر میں کرفیو سخت کر دیا تھا۔ مسلسل چار روز تک کرفیو میں کوئی ڈھیل نہیں دی گئی۔ گھروں میں غذائی اجناس کا ذخیرہ بھی ختم ہونے لگا تھا۔ بیمار دوائی کیلئے تڑپنے لگے اور شیر خوار دودھ کے لئے بلکنے لگے۔ دن کو کما کر شام کو کھانے والے فاقہ کشی کا شکار ہونے لگے۔ امیر لوگ بھی اس گھریلو حراست سے کم تنگ نہ آئے ہوئے تھے۔ رات کے دس بجے ہوئے

تھے۔ بجلی ہونے کی وجہ سے سارا شہر ہی گھپ اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا..........،، دلاور اور شکیلہ دونوں بچّوں سمیت کمرے کے ایک کونے میں دُبکے ہوئے تھے۔ کمرے میں موم بتی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جل رہا تھا کہ اچانک دھڑام کی آواز سن کر دونوں بچّے ماں باپ سے لپٹ گئے، دلاور نے اُٹھنے کی کوشش کی تو شکیلہ نے سرگوشی میں دلاور سے کہا،،

لگتا ہے کسی نے پچھلی طرف کی دیوار گرادی، ہاں مجھے بھی یہی لگتا ہے کہتے ہوئے دلاور کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی..........،، ماں باپ کی یہ حالت دیکھ کر دونوں بچّے خوف سے کانپنے لگے، پاپا..........! اب کیا ہوگا؟ وہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے!

آخر کار اس کافر نے اپنی اوقات دکھا ہی دی، کمینہ کہیں کا..........! دلاور سریندر کو کوسنے لگا۔ شکیلہ کو شانتی کی دھمکی یاد آئی کہ ایک دن گالیوں کا ایسا مزا چکھاؤں گی کہ یادرکھے گی،، دفعتاً شکیلہ کی آنکھوں کے سامنے گجرات فسادات کے مناظر رقص کرنے لگے تو اس کی روح کانپ گئی۔ اس نے دونوں بچّوں کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا،، وہ ڈرتے ہوئے بولی،، آج یہ کافر ہمیں نہیں چھوڑیں گے،، سوچتے ہونگے کہ فساد میں کون پوچھے گا؟ پھر دلاور اپنی جگہ سے اٹھ کر پچھلے کمرے میں کچھ ڈھونڈنے لگا..........،، باہر کسی کو آواز تو دو! کس کو آواز دوں؟ باہر تو فوج ہی فوج ہے اور وہ بھی اُنہی کی ہے..........،، یا اللہ! اب کیا ہوگا؟ یہ لوگ تو سچ مچ ہم کو ختم

ہی کر دیں گے! تم فکر مت کرو، مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے، دلاور نے ہاتھ میں کوئی چیز اٹھاتے ہوئے کہا،، ڈر ڈر کے مرنے سے بہتر ہے کہ ہم مقابلہ کر کے مریں، پھر دلاور نے بیوی اور بچوں کو کلہاڑی، لوہے کی سلاخ............ بیلچہ اور کُدال دیتے ہوئے کہا، جونہی دروازہ کھلے گا حملہ کر دینا ....،، دروازے پر دستک تیز ہوگئی تو اُن کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی۔ یوں لگ رہا ہے جیسے دل اُچھل کر سینے سے باہر آجائے گا............،، لوہے کی آواز سن کر شکیلہ خاوند سے کہنے لگی،،

ان کے پاس ترشول اور تلواریں ہونگی۔ ہم ان معمولی اوزاروں سے اُن کا مقابلہ کیسے کریں گے؟

جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا............! تم سارے کلمہ پڑھ لو۔ پھر سارے کلمہ پڑھ کر دروازے کی پشت پر کھڑے ہوگئے۔ اب دروازے کو زور زور سے دھکے لگنے لگے۔ باہر سے کچھ سرگوشیوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ آخر کار دلاور نے دروازہ کھولنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے پھر ایک بار بیوی اور بچّوں کو یاد دلایا کہ کیا کرنا ہے۔ تم تیار رہنا،، آؤ کافرو مارو ہمیں،، کہتے ہوئے دلاور نے دروازہ کھول دیا،، باہر کا منظر دیکھ وہ بھونچکا رہ گیا۔ ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے ان کے اوزار جم گئے اُن کی آنکھیں فرط جذبات سے بھر آئیں دروازے کے باہر سریندر، شانتی اور اُن کے دونوں بچّے کھانا اور برتن اٹھائے ہوئے کھڑے تھے۔

............☆☆☆............

امّی گھر چلو نا

عدالت کے احاطے میں کھڑی زرینہ اپنے چھوٹے سے بیٹے کاشف کو اٹھائے اپنے وکیل کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اسے واقعی احساس ہوا تھا کہ لوگ مقدمہ بازی سے گریز کیوں کرتے ہیں! عدالتوں اور وکلاء سے نجات کیوں مانگتے ہیں۔ زرینہ سوچ رہی تھی کہ یہ وکیل بھی تو عجیب ہوتے ہیں جو اپنے موکل کو دیر تک انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ کیس کو لٹکاتے لٹکاتے برسوں لگا دیتے ہیں اور غریب موکلوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہو جاتے ہیں۔ اب تک تو وہ اس معاملے میں کافی تجربہ حاصل کر چکی تھی۔ کیونکہ مسلسل اڑھائی سال سے وہ اپنے وکیل کا پیٹ روپیوں سے بھر رہی تھی۔ اب تو وکیل کی توند بھی نکلنے لگی تھی لیکن مقدمہ تھا کہ انگور کی بیل کی طرح لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اُس بچاری کے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ وہ مقدمہ لڑتی مگر گاؤں کے زمیندار کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ حکومت کی طرف سے

محکمہ تعلیم بالغاں کے ذریعے ناخواندگی دور کرنے کے لئے چلائے جارہے سنٹر کتنی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں کیونکہ پچھلے سات سال سے اس کے گاؤں میں یہ سنٹر فقط کاغذات میں کھولے گئے تھے۔ اصل میں ان سنٹروں کا کہیں وجود تک نہیں تھا۔ ان سنٹروں سے کتنے لوگ فیضیاب ہوئے تھے یا ہورہے تھے یہ تو محکمہ تعلیم کے اعلیٰ آفیسران بھی اچھی طرح جانتے تھے......'' زمیندار نے سوچا اچھا ہی ہوا جو یہ سنٹر ایمانداری کے ساتھ نہیں چلے ورنہ یہاں کی ساری جہالت دور ہوجاتی پھر اس کی روٹی روزی کا کیا ہوتا...... وہ کس سے سُود وصول کرتا۔ اشٹام پر کیا تحریر لکھی ہوئی تھی، زرینہ کو کیا معلوم؟ اس نے تو اپنی زمین گھروہی رکھ کر کچھ روپے بطور قرض لینے تھے۔ لیکن زمیندار نے تو خاص قسم کی سیاہی سے اس کے ہاتھ ہی قلم کر دیئے تھے۔ گاؤں کا سرپنچ تو اس پر کم اور اس کی پُرشباب جوانی پر زیادہ مہربان تھا۔ اس کے شوہر پر چلایا جارہا مقدمہ سچا تھا یا جھوٹا۔ یہ جاننے کی کسی نے بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اب تو زرینہ کی زبان بھی یہ کہتے کہتے تھک چکی تھی کہ ناصر بے قصور ہے۔ اس پر چلایا جارہا مقدمہ بے بنیاد ہے۔ اس کے شوہر نے اپنے دیش کے ساتھ کوئی غداری نہیں کی...... وہ تو ایک بھولا بھالا کسان تھا...... وہ دیش کے غداروں کا ساتھ کیسے دے سکتا ہے اس نے تو پڑھا تھا کہ اپنے وطن سے محبت کرو اور حاکم وقت کا احترام کرو...... پھر وطن سے محبت تو ایمان کا ایک جُز ہے۔ اس کو تو اپنے وطن پر فخر تھا جس میں وہ آزادی کا سانس لے رہا تھا۔ اپنے وطن کی جمہوریت کی

تو وہ مثال دیتا تھا۔ جہاں بغیر کسی امتیاز کے تمام مذاہب کو مساوی حقوق حاصل تھے۔ جہاں مسجدوں کی اذان اور مرلی کی تانیں ایک ساتھ فضاؤں میں گونجتی تھیں۔ جہاں کی ایکتا سے دشمن آج بھی خوف کھاتا ہے۔ وطن کی خوشحالی کے تو وہ نغمے گایا کرتا تھا۔ لہراتے ترنگے کو دیکھ کر تو اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی تھی۔ وہ تو مہاتما گاندھی کے اصولوں کا احترام کرتا تھا وہ تو بھگت سنگھ اور حوالدار عبدالمجید جیسے جیالے نوجوانوں کے نقشِ قدم پر چلنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ تو دیش کا ایک محنتی کسان تھا جس کا ہل ہر سال ہزاروں ٹن اناج پیدا کرتا تھا کئی مرتبہ گاؤں میں سب سے زیادہ اناج پیدا کرنے پر اسے حکومت کی جانب سے انعام واکرام سے نوازا گیا تھا۔ بس تب سے ہی وہ گاؤں کے سرپنچ اور زمیندار کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا..... وہ ایک سچا دیش بھگت تھا۔ پھر بھلا اسے دیش دروہی کیوں ٹھہرایا گیا۔ اس نے تو ہمیشہ دوسروں کے راستے میں پھول بچھائے تھے۔ سب کو محبت بانٹی تھی۔ پھر اس کی ذات پر یہ بدنما داغ کیوں لگا۔ آخر کس نے اس کے بارے میں سراغ رساں ایجنسی کو یہ غلط خبر دی کہ اس کے تعلقات دہشت گردوں کے ساتھ ہیں...... مانا کہ وہ زیادہ امیر نہیں تھا۔ مگر عزت کی کماتا کھاتا تو تھا۔ اس کے پاس وہ کردار تو تھا جس سے وہ سب کا دل جیت سکتا تھا۔ دل کی وہ دولت تو تھی جو بانٹنے سے کم نہیں ہوتی۔ آج وہی کردار ٹوٹ کر بکھر چکا تھا..... وہ کسان ہی سہی مگر ان لوگوں سے اچھا تھا جو کرسی کی خاطر دیش میں مذہبی فسادات کراتے ہیں..... مذہب اور ذات پات

کے نام پر لوگوں کو بانٹ کر ووٹ بٹورتے ہیں......ان لیڈروں سے تو اچھا تھا جو دیش کے دشمنوں کو دیش کے خفیہ کاغذات فروخت کرتے ہیں اور پھر بڑی بڑی کوٹھیوں کے مالک بن جاتے ہیں......'' زرینہ بچاری تو زمیندار کی مہربانیوں کو ہمدردی سمجھتی رہی......'' کیا زمیندار اور گاؤں کے سرکردہ لوگ ''ناصر'' کے حق میں گواہی دے کر اسے رہا نہیں کرا سکتے تھے؟ وہ بھی تو برسوں سے اسی گاؤں میں بس رہا تھا۔ اس کی کئی پُشتیں یہاں کی بنجر دھرتی کو اپنے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر لہولہان کر چکی تھیں۔ تب جا کر کہیں یہ گاؤں آباد ہوا تھا۔ یہاں کی زمین زرخیز بنی تھی......اس سے بڑھ کر وہ دیش بھگتی کا ثبوت اور کیا دیتا کہ مرنے کے بعد بھی اس کے آباواجداد اپنی ہڈیاں اسی زمین کے نیچے چھوڑ گئے اس نے تو اپنے آباواجداد کے خوابوں کو جلا بخشی تھی............''

وہ لوگ چاہتے تو ''ناصر'' کو رہا کرا سکتے تھے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرتے۔ اس طرح تو ان کے مفادات دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ ان کے شیطانی ارادوں پر پانی پھر جاتا......زرینہ کو عدالت کا دروازہ کس نے دکھایا تھا۔ یہی زمیندار ہی تو تھا جس نے ایک دستی خط دے کر زرینہ کو شہر کے سب سے مہنگے وکیل کے پاس روانہ کیا تھا۔ تاکہ وہ جلدی زمین جائداد بیچنے پر مجبور ہو جائے۔ زمیندار اچھی طرح جانتا تھا کہ زرینہ نے اپنی برادری کے فیصلے کے خلاف ''ناصر'' سے شادی کی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ زرینہ ''ناصر'' کی جدائی زیادہ دنوں تک

برداشت نہیں کر سکے گی۔ ابھی ان کی شادی کو دو ہی سال ہوئے تھے اور اسی عرصہ میں قدرت نے اس کی آغوش میں چاند سا بیٹا ''کاشف'' ڈال دیا تھا آخر ننّھا ''کاشف'' بھی کب تک اپنے والد کی شفقت سے محروم رہتا۔ زمیندار چاہتا تھا کہ زرینہ کی طرف قرض کی رقم اس قدر بڑھ جائے تاکہ وہ سود سمیت نہ چکا سکے اور قرضہ نہ چکانے کی صورت میں اس کی ساری زمین جائیداد کا وہ مالک بن جائے۔ اس طرح زمیندار کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا۔ وہ اس زمین پر ایک جدید طرز کا سنیما گھر تعمیر کرانا چاہتا تھا۔ اس نے تو سنیما گھر کا نقشہ بھی بیرون ملک سے بنوا کر رکھ لیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک بار ''ناصر'' سے بات بھی کی تھی۔ لیکن ''ناصر'' نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سنیما گھر کھلنے سے جرائم پیشہ افراد کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔ اتنے بڑے گاؤں کا سکون درہم برہم ہو جائے گا۔ سنیما کے اچھے اثرات عوام پر کم ہی پڑتے ہیں اس کے برعکس بُرے اثرات عوام جلد قبول کرتی ہے اس لئے آپ مجھے معاف رکھیں.........

میں اپنی زمین اس لئے بھی نہیں فروخت کروں گا کیونکہ میں نے اس زمین پر آٹے کی مل کھولنے کا فیصلہ کیا ہے گاؤں کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح ایک تو گاؤں والوں کو اپنا اناج فروخت کرنے میں آسانی ہوگی۔ دوسرا یہاں کے لوگوں کو روزگار مل جائے گا۔ پہلے تو زمیندار اسے ایک ٹک دیکھتا رہا پھر اس نے سوچا وہ جسے آج تک بھولا بھالا کسان سمجھتا رہا۔ وہ تو بے حد چالاک اور شاطر نکلا۔ آج اس کے حوصلے دیکھ کر

زمیندار سوچنے لگا، کہ شکل دیکھ کر کسی کی شخصیت کا اندازہ کبھی نہیں لگانا چاہیے۔ اس دن سے ہی زمیندار نے قسم کھائی تھی کہ وہ اسی زمین پر سینما گھر بنوائے گا چاہیے اس کے لئے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔ پھر اس نے اپنے منصوبے پر عمل کر کے ایک بے گناہ کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا...... اب تو اسے اپنا منصوبہ کامیاب ہوتا دکھائی دے رہا تھا......

زرینہ چاہتی تھی کہ چاہے جتنا روپیہ بھی خرچ ہو جائے۔ چاہے ساری جائیداد فروخت کرنی پڑ جائے۔ لیکن اس کا سر تاج واپس آجائے۔ اب زرینہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان حالات کا مقابلہ کرسکتی۔ وہ سب جانتی تھی کہ اس سے کون کیا چاہتا ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم تھا کہ وکیل نے بھی کئی مرتبہ اس کے جسم کو ہوس بھری نظرں سے دیکھا تھا...... "ہر مہینے گاؤں سے شہر تک سفر کرتے کرتے اس کا وجود ٹوٹ چکا تھا۔ کرتی بھی کیا......؟ "ناصر" پر P.S.A لگا ہوا تھا۔ اسی بہانے تو وہ ناصر کا منہ دیکھتی اور اس سے باتیں کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی تھی۔ ورنہ جیل میں اس سے ملاقات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا...... کبھی ایک سپاہی اس کے جسم کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تو کبھی دوسرا ناصر سے ملوانے کے لئے اس سے اپنے مطلب کی باتیں کرتا۔ وہ سوچتی، آخر ان لوگوں نے عورت ذات کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ شاید انہوں نے عورت کو کبھی، درگا، کالی، اور جھانسی کی رانی کے روپ میں نہیں دیکھا ورنہ یہ لوگ عورت کو کبھی اتنا کمزور سمجھ کر اس کی مجبوریوں کا فائدہ نہ اٹھاتے ...... وہ اب ان حالات سے

نجات چاہتی تھی۔ ابھی وہ خیالات کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ اس کے وکیل نے زرینہ کا ندھا تھپتھپاتے ہوئے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا...... وکیل کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے تجسس بھرے لہجے میں وکیل سے پوچھا! وکیل بابو! وہ جیل سے رہا تو ہو جائیں گے نا......؟ وکیل نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا" چھوٹ تو جائے گا! لیکن کیا؟؟؟ زرینہ سرکاری وکیل کے حوصلے کافی بلند نظر آتے ہیں ......" پہلے تو اس کے حوصلے توڑنے ہونگے! پھر توڑیئے نا وکیل بابو" زرینہ نے معصومیت سے کہا...... دیکھو زرینہ تم روپیوں کا بندوبست کرو تا کہ ہم اسے خرید سکیں...... کیا؟؟ یہ الفاظ سن کر زرینہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا...... وکیل بابو یہ کیسے ممکن ہے؟ اری پگلی اس دیش میں کیا ممکن نہیں............ اسی لئے تو یہ دیش سونے کی چڑیاں سے صرف چڑیاں رہ گیا ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ انصاف بھی بکتا ہے؟ دیکھو تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے پیڑ گننے سے نہیں............ لیکن وکیل بابو!

"............ اف او زرینہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ...... دیکھو آج جرح تھی اگلی تاریخ پر فیصلہ ہو جائیگا۔ ناصر کی رہائی کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ سچ وکیل بابو؟ زرینہ خوشی سے جھوم اٹھی" اس نے سوچا ایک مہینے کی تو بات ہے جیسے تیسے گذار لے گی۔ جلد ہی اس کی خوشی پر فکر کی اوس پڑ گئی جب وکیل نے کہا، لیکن زرینہ میری چار پیشیوں کی فیس بقایا ہے اگلی تاریخ پر چکا دینا...... ورنہ......!!! کہہ کر وکیل تو چلا گیا پر زرینہ کے ذہن پر ورنہ جیسا

پہاڑ کو ہسار بنتا چلا گیا۔ اس نے کاشف کو گود میں اٹھایا اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گئی............'' گھر پہنچ کر اس نے کاشف کو اپنی چھاتی سے دودھ پلانا چاہا۔ لیکن کاشف تو بس کراہ رہا تھا۔ شاید غم اور فکر کی وجہ سے زرینہ کی چھاتیوں کا دودھ سوکھ چکا تھا۔ جب سے ناصر اس سے جدا ہوا تھا اس کا کھانا پینا حرام ہو چکا تھا وہ تو روز شام کو بازار سے کچھ نہ کچھ پھل وغیرہ لے کر گھر لوٹتا تھا۔ پھر دودھ کہاں سے بنتا۔ آج پھر اسے کاشف کے لئے پڑوس کی موسی سے دودھ لانا پڑا۔ ایک موسی ہی تو تھی جو اس کی دکھ درد کو سمجھتی تھی۔ جب زرینہ نے اسے سنایا کہ ناصر اگلے ماہ رہا ہونے والا ہے تو موسی خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اس نے زرینہ سے کہا جب تک ناصر رہا نہیں ہو جاتا زرینہ اسی کے ساتھ رہے گی وہ تو اس کی بیٹی کی طرح ہے......عدالت کی تاریخ میں اب صرف چند دن باقی تھے اور وکیل کے کہے ہوئے الفاظ زرینہ کے کانوں میں گونج رہے تھے وہ پھر ایک بار سوچوں کے گرداب میں پھنس گئی ...... دوسرے دن مجبور ہو کر زرینہ پھر زمیندار کے در پر جا پہنچی اور اس سے مزید قرض کی خواہش ظاہر کی تو زمیندار کی بھنویں تن گئیں......''

زمیندار نے اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا اب تمہارے پاس کیا رہ گیا ہے جس کے عوض تم قرض حاصل کرنا چاہتی ہو؟ ساری اراضی تو تم پہلے ہی گروی رکھ چکی ہو......'ہاں ایک مکان ضرور بچا ہے۔ لیکن اگر تم اس کے عوض قرض لوگی تو رہو گی کہاں؟ مجھے تو قرض دینے میں

کوئی حرج نہیں البتہ تمہاری حالت پر ترس آتا ہے اس لئے تم کوئی دوسری ترکیب نکالو۔ جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ جائے......زرینہ اس کی پہیلیوں میں الجھ بیٹھی......''دوسری ترکیب کون سی ہے؟ میں سمجھی نہیں......زمیندار کھسیانی ہنسی ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولا دیکھو زرینہ! تم یہ سب کچھ کس کے لئے کر رہی ہو؟ اپنے شوہر کے لئے نا......! تمہارا شوہر تو واپس آہی جائے گا۔ پھر وہ تمہیں ناپ تول کر تو گیا نہیں ہے اس لئے میری مانو اس پُر شباب حسن سے فائدہ اٹھاؤ تو روپیوں کی بارش ہوجائے گی......' آخ تھو! زرینہ نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا، میں تھوکتی ہوں ایسے روپیوں پر جو عزت بیچ کر کمائے جائیں......میں مشرق کی بیٹی ہوں...... مجھ میں سیتا کی روح اور عائشہ کی پاکیزگی بسی ہے۔ یہ پاکیزا آنچل میرا کفن تو بن سکتا ہے مگر میں اسے داغدار نہیں ہونے دوں گی۔ اس کی حفاظت کے لئے میں اپنی جان کو ترجیح دوں گی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا گھر ہی گروی رکھ دے گی۔ شاید خدا کی طرف سے اس کے شوہر کے تئیں اس کی اطاعت کا امتحان ہے۔ پھر ایک بار اس نے کورے اشٹام پر انگوٹھا لگایا اور زمیندار سے روپے لے کر شہر کی طرف روانہ ہوگئی......'' راستے میں اسے ایک ہمدرد مل گیا جس نے بس اسٹاپ تک اس کے بیٹے کو گود میں اٹھایا......بس میں سوار ہوتے وقت زرینہ نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا وہ سوچنے لگی۔ آج بھی انسانیت زندہ ہے؟ خدا نے ضرور کسی فرشتے کو بوڑھے کے بھیس میں اس کے لئے بھیجا تھا۔ چونکی وہ اس وقت

جب بس کنڈیکٹر نے اس سے کرایہ مانگا اسکے ہینڈ بیگ سے پرس غائب تھا۔ اسے فوراً اس بوڑھے کا خیال آیا جسے وہ فرشتہ سمجھ رہی تھی۔ دو گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کے رخساروں پر بہہ گئے۔ اس کا کرایہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے ادا کیا۔ زرینہ نے اس کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تو دوپٹے سے آنسو پونچھ ڈالے۔ اب اس کے پاس وکیل کو دینے کے لئے کچھ نہ بچا تھا۔ آج پھر وہ ایک بار انصاف کے مندر کے باہر انصاف کے اندھی دیوی سے انصاف کی امید لگائے بیٹھی تھی......" اس کی آنکھیں ناصر کے دیدار کیلئے ترس گئیں تھیں۔ اچانک اس کی نظر ہتھکڑیوں میں جکڑے ناصر پر پڑی تو وہ تڑپ اٹھی.......... یہ کیا؟ وکیل بابو تو کہہ رہے تھے کہ آج آپ رہا ہو جائیں گے! زرینہ نے ناصر کے قریب پہنچ کر پوچھا" نہیں زرینہ انصاف کی اندھی دیوی نے اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولنے سے انکار کر دیا۔ شاید اس میں سچائی دیکھنے کی ہمت نہیں تھی اور سرکاری وکیل نے جھوٹی دلیل دے کر مجھے وطن سے غداری کرنے کے جرم میں سزا سنوا دی۔ زرینہ تمہارا وکیل، وکیل نہیں کالے کوٹ میں چھپا ہوا بھیڑیا ہے۔ وہ پہلے ہی زمیندار اور سرپنچ کے ہاتھوں بک چکا ہے اور آج تک تمہیں بے وقوف بنا کر روپے اینٹھتا رہا.........." ناصر کو پولیس کے سپاہی کھینچ کر لے گئے۔ وکیل پر نظر پڑتے ہی زرینہ اس پر برس پڑی.........." وکیل جھنجلاتے ہوئے بولا" دیکھو زرینہ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ روپیوں کا بندوبست کرنا..........

سرکاری وکیل نے ہار ماننے سے انکار کر دیا اور پھر یہ میرا پہلا کیس ہے جو میں نے ہارا ہے۔ گھبراؤ نہیں زرینہ! امید کی کرن ابھی باقی ہے میں تھوڑا جلدی میں ہوں تم میرے گھر پہنچو میں تمہیں سب سمجھاتا ہوں.........!

مرتی کیا نہ کرتی، تھوڑی دیر بعد زرینہ وکیل کے گھر پہنچ گئی تاکہ وہ امید کی کرن سے اپنی زندگی کی تاریکی دور کر سکے.........وہ وکیل کی باتیں ہمہ تن گوش سنتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا.........زرینہ ہم ہائیکوٹ میں اپیل دائر کر دیں گے۔ ناصر کی رہائی کے لئے ہم جدوجہد کریں گے۔ لیکن زرینہ ہائیکوٹ کی فیس اتنی زیادہ ہے کہ تم ادا نہیں کر سکو گی۔ وکیل بابو! میں ناصر کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی ہوں اس کے بغیر میرا ہے ہی کون؟ ہر قیمت پر! سن کر وکیل کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے لوہا گرم دیکھ کر ہتھوڑا دے مارا۔ زرینہ میں تمہارا یہ کیس ہائیکوٹ میں بغیر فیس کے لڑوں گا اگر تم چند راتیں میرے ساتھ گذارو۔ تمہارے اس خوبصورت جسم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ کہتے ہوئے وکیل نے اس کا دوپٹہ عجب انداز سے پکڑ لیا۔ اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی اور آنکھوں میں ہوس کی آگ دہک رہی تھی۔ زرینہ کے کانوں میں ناصر کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ واقعی وکیل زمیندار اور سرپنچ کا پالتو آدمی ہے کیونکہ زمیندار نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔ اسے یہ سودا قطعی منظور نہیں تھا۔ زرینہ کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ اس نے مزاحمت کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنے بیٹے کاشف کو کس کے پکڑ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے میز پر رکھا ہوا پیتل کا گلدان اٹھا کر

وکیل کے سر پر دے مارا۔ جلد ہی وکیل کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر زرینہ کاشف کو لے کر سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچ گئی جہاں اس نے اقبال جرم کر لیا۔ اس بار پھر انصاف کی اندھی دیوی نے فیصلہ سنایا کہ جب تک کاشف ماں کا دودھ پیتا ہے وہ زرینہ کے ساتھ ہی جیل میں رہے گا..........."

فیصلہ سن کر زرینہ کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ جیل کی زنانہ بارک میں کاشف ماں سے بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ......! امی گھر چلو نا......! زرینہ اس معصوم کو کیسے سمجھائے کہ اب یہی اس کا گھر ہے۔

...........☆☆☆...........

دَلدل

شام کی پُر فضا ہوا سے سارا شہر معطر ہو رہا تھا۔ شام کا دھندلکا ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے بازار میں لوگوں کی آمدورفت کافی حد تک بڑھ چکی تھی۔ سبزی منڈی سے تھوڑی ہی دور ہیرا بائی اپنے کوٹھے پر بیٹھی پان کی سبز پتوں پر کتھا اور چونا لگا رہی تھی۔ جوانی میں تو وہ گاہکوں کو خوب چونا لگاتی اور کتھا سناتی تھی لیکن اب اس کے سر کے بال چاندی کی طرح چمکنے لگے تھے۔ اس کی جبیں پر بل پڑ چکے تھے۔ گالوں کی لالی زردی میں تبدیل ہو چکی تھی جس سے اس کے حسن کی چمک پھیکی پڑنے لگی تھی جب کلی میں رس ختم ہو جائے تو بھنورا ادھر کا رخ بھی نہیں کرتے۔ یہی حال طوائف کا بھی ہوتا ہے۔ جب اس کی جوانی پُر شباب ہوتی ہے تو دن رات چاہنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور جب جوانی کی بہار ڈھلنے لگتی ہے تو اس کے چاہنے

والے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جس طرح گدھے کے سر سے سینگ
......جب بھی ہیرا بائی کے گلشن میں کوئی نئی کلی چٹکنے لگتی تو اس کی مہک سونگھ کر
کوٹھے کے ارد گرد بھنورے بے اختیار منڈلانے لگتے۔ ہیرا بائی کے زیر
سایہ تربیت پانے والی رقاصاؤں کا رقص دیکھنے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ اکثر شہر
کے باعزت اور شریف لوگ رات کی تاریکی میں اُجلے لباس پہن کر اس
بزم میں آتے اور اس بزم کی شراب سے لطف اندوز ہوتے......رات کے
اندھیرے میں وہ چاہیے کچھ بھی کر لیں مگر سحر ہوتے ہی وہ اپنے چہروں پر
عزت اور شرافت کا نقاب چڑھا لیتے۔ باہر گلی میں شور سن کر ہیرا بائی پاندان
کو ایک طرف رکھتے ہوئے اٹھی اور کھڑکی سے باہر جھانکی...... جگا پر نظر
پڑتے ہی ہیرا بائی کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اس کے باچھیں کھل
گئیں۔ جلد ہی اس نے اپنی نظر دروازے پر مرکوز کر دی......دروازے
سے داخل ہوتے ہی جگا نے اپنے ساتھ لائی ہوئی لڑکی سے کہا یہ میری آنٹی
کا محل ہے، جاؤ، جا کر پاؤں چھو لو......لڑکی نے آگے بڑھ کر ہیرا بائی کے
پاؤں چھوئے...... ہیرا بائی نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا
......ارے جگا! تو تو چاند کا ٹکڑا لایا ہے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ہیرا بائی ایک
کمرے میں لے گئی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی لڑکی خوشی سے جھوم اٹھی۔
وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ کمرے کے دیواروں پر جگا کی انگنت
تصاویر آویزاں تھیں کمرے میں بچھے ہوئے قیمتی قالین سے محسوس ہو رہا
تھا کہ کسی امیرزادے کا محل ہے۔ لڑکی دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اس

نے جگا سے شادی کر کے اور اپنے والدین سے بغاوت کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ گھر میں پڑی رہتی تو جہیز کی وباء کے باعث کنواری ہی رہ جاتی۔ اچھا ہوتا اگر دیدی بھی جگا جیسے کسی نیک اور شریف کا ہاتھ تھام لیتی۔ اس طرح اس کی زندگی سنور جاتی اور والدین کا بوجھ بھی کم ہو جاتا۔ نہ جانے وہ کب تک سوچ میں ڈوبی رہتی لیکن ہیرا بائی کی آواز پر وہ چونک پڑی...... بیٹی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دینا ہیرا بائی نے بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود کمرے سے باہر نکل گئی ...... ہیرا بائی کے چنگل میں پھنسنے والی وہ کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی بلکہ اس سے قبل بھی کئی لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ گھر سے بھاگ کر اس جہنم کی بھٹی میں جلنے کے لئے پہنچ چکی تھیں...... ہیرا بائی نے دوسرے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے کھڑا جگا کو دیکھ کر مسکرائی۔ جواب میں جگا بھی مسکرا دیا کیسی لگی نئی چڑیا...... جگا نے سگریٹ کا ٹکڑا جوتے سے مسلتے ہوئے پوچھا۔ پہلے سے بہتر ہے۔...... ہیرا بائی نے مختصر جواب دیا...... بس بہتر...... جگا حیرانگی سے بولا............ ارے ہیرا بائی بڑھاپے میں تیری آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ پان کے پتوں کو چونا لگاتے لگاتے تجھے بھی چونا لگ گیا ہے۔...... یہ تو خالص ہیرا ہے ہیرا...... اس ہیرے سے تمہارا سارا کوٹھا جگمگا اٹھے گا۔ گاہکوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔ اچھا جگا یہ بتا یہ لڑکی تو کافی چالاک معلوم ہوتی ہے۔ پھر تیرے قابو میں کیسے آ گئی۔ ہیرا بائی نے دریافت کیا۔ ہیراا بائی آج کل کی لڑکیاں جہیز کی کارن بے بس ہو چکی ہیں اور پھر پیار کے دو

میٹھے بول سنا دو یا محبت بھرے چار الفاظ لکھ دیئے تو لڑکی خوش اور بغیر جہیز کے شادی کی پیشکش کی تو وہ فوراً قبول کر لیتی ہیں۔ یہ بھی گھر سے بھاگ کر آئی ہے۔ سالی چلی تھی بغیر جہیز کے جگا سے شادی کرنے۔ جگا نے پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا...... پھر جگا نے لڑکی کو پانچ ہزار میں فروخت کر دیا۔

جگا نوٹ گنتا ہوا سیڑھیاں اُترنے لگا تو سامنے اس کی نظر آتے ہوئے دلاور پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور جلدی جلدی روپے جیبوں میں ٹھونسنے لگا اور کپڑے درست کرتا ہوا نیچے اتر گیا دلاور کے پاس سے گذرتے وقت اس کا ہاتھ بے اختیار سلام کے لئے اٹھ گیا...... دلاور اس شہر کا مانا ہوا غنڈا تھا، سارے شہر پر اس کا دبدبہ تھا۔ دلاور بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا یہ لمبا قد چوڑا سینہ...... موٹی موٹی آنکھیں...... لمبے لمبے سیاہ بال، فرنچ کٹ داڑھی میں اس کا چہرہ بے حد پرکشش لگ رہا تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا۔ شلوار قمیض اور پشاوری چپل میں وہ کابل کا پٹھان لگ رہا تھا لیکن ہر بار گواہ نہ ہونے کے سبب اس کی رہائی ہو جاتی۔ دلاور غریبوں کا ہمدرد تھا، ہر انسان کی طرح اس کے سینے میں بھی ایک دل تھا، ایک جذباتی دل...... ایک ہمدرد دل...... وہ اکثر ہیرا بائی کے کوٹھے پر آتا تھا۔ ہیرا بائی پر اس کے انگنت احسانات تھے جبھی تو ہیرا بائی اس کی بے حد عزت کرتی تھی۔ دلاور ہیرا بائی کے ہال نما کمرے میں داخل ہوا ہیرا بائی نے اسے خوش آمدید کہا تشریف رکھیئے۔ بندی حُقہ پانی کا بندوبست کرتی

ہے۔ہیرا بائی ہانپتی ہوئی بولی اور خود سیڑھیوں سے اتر کر نیچے چلی گئی۔

اور دلاور نیم دراز ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کشمش او کشمش، آواز سنتے ہی کُسم اپنے کمرے سے باہر آ گئی اور دلاور کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ دلاور اور کُسم کی محبت سے بے خبر تھی تو بیچاری ہیرا بائی۔ دلاور کُسم سے بے انتہا محبت کرتا تھا کُسم بھی اس پر پہلی نظر میں ہی فدا ہو چکی تھی......لیکن ہیرا بائی کو پیار کے نام سے نفرت تھی کیونکہ محبت میں دھوکہ کھانے کے بعد ہی وہ اس جہنم میں پہنچی تھی...... کتنے دنوں کے بعد آئے ہو......جانتے ہو یہ دن ہم نے تمہاری جدائی میں کیسے کاٹے ہیں۔...... جاؤ ہم آپ سے نہیں بولتے ، کُسم انداز بے نیازی سے منہ پھیرتے ہوئے بولی۔ کُسم کو دلاور پیار سے ''کشمش'' پکارتا تھا۔ دلاور کُسم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔ دیکھو کشمش میرا یہاں روز آنا مشکل ہو جاتا ہے ویسے بھی شہر سے باہر گیا ہوا تھا آج ہی لوٹا ہوں اور سیدھا ادھر ہی آ رہا ہوں۔ کُسم کی آنکھوں میں موتی چھلکنے لگے۔ارے یہ کیا؟ دلاور نے کُسم کے رخسار سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا '' دیکھو! کشمش ایسے دل چھوٹا کرو گی تو کچھ نہ ہوگا دلاور نے کُسم کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا: ''اگر میں تمہاری نہ ہوسکی تو ......تو......تو میں زہر کھالوں گی ......'' نہیں کُسم ...... دلاور نے کُسم کے لبوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ہمیں حالات سے مقابلہ کرنا ہوگا ہمیں جدائی کی ہر دیوار گرانی ہوگی اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا''۔ ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ہیرا بھائی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی کُسم کے

چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں کُسم کو دلاور کے بالکل قریب بیٹھے دیکھ کر وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی...... کُسم ...... ہیرا بائی کی بارعب آواز کمرے میں گونج گئی۔ کُسم اٹھ کر فوراً اندر چلی گئی، ہیرا بھائی کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ کُسم کو اس راستے پر چلنے نہیں دے گی۔ وقت کا پنچھی اپنا سفر طے کرتا رہا۔ اب ہیرا بائی یہاں سے کھسکنے کیلئے تیار تھی......

دوسرے دن صبح سویرے ہی سارے محلے میں شور مچا ہوا تھا کُسم بھاگ گئی...... کسم بھاگ گئی۔ ہیرا بائی کو بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اسے کچھ لوگ سنبھال رہے تھے۔

دلاور بس کی پشت والی سیٹ پر آرام سے بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا اور کُسم سب سے آگے والی سیٹ پر بُرقعہ پہنے بیٹھی تھی۔ بس بل کھاتی ہوئی سڑکوں پر برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ دلاور اور کسم سوچوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ بس ایک جھٹکے سے رکی۔ دلاور اور کُسم بس سے اُتر کر ایک تنگ گلی میں گھس گئے......دن گذرتے گئے دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار طریقے سے گزر رہی تھی کُسم بہت خوش تھی کہ دلاور سب بُرے کام چھوڑ کر ایک اچھا انسان بن گیا ہے اور عزت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ پھر اسے کوٹھے کی جہنم بھری زندگی سے نجات دلانے والا بھی تو دلاور ہی تھا۔ وہ دلاور سے بے حد پیار کرتی تھی دلاور بھی اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتا تھا دلاور ایک رائفل فیکٹری میں کام کرنے لگا تھا۔ شام کو

جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو کُسم اپنی محبت اور خدمت سے اس کی ساری تھکاوٹ دور کر دیتی۔ دلاور اپنی قسمت پر ناز کرتا کہ اس طرح ان کی شادی وک تیسرا سال لگنے لگا ایک روز جب وہ گھولوٹ رہا تھا تو گلی کی نکڑ سے کسی شخص کو اس نے مکان کی کھڑکی کے قریب کُسم سے باتیں کرتے دیکھا تو اسے فوراً یاد آیا کہ کل شام جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اسے اندھیرے میں ایک سایہ کھڑکی کے پاس سے بھاگتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس وقت اس نے دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ حد سے زیادہ تھکا ہوا تھا...... اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات ابھرنے لگے اور دل میں کئی شبہات پیدا ہونے لگے۔ ضرور کوئی کوٹھے کا یار ہوگا۔ یہاں بھی پہنچ گئے سالے...... وہ بڑبڑایا...... اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ اتنا بڑا دھوکہ۔ پیار کے نام پر فریب...... آخر طوائف کی بیٹی طوائف ہی نکلی، نالی کا کیڑا نالی میں اچھا لگتا ہے...... اچھا تھا سالی وہیں پر رہ کر کسی کے بستر کی چادر بنتی ...... یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ بدحواسی کے عالم میں آگے بڑھا اور پھر ایک زوردار دھماکے کی آواز فضا میں گونج گئی۔ گولی کی آواز سن کر لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔ بروقت پولیس بھی پہنچ گئی...... ''یو آر انڈر اریسٹ'' انسپکٹر نے دلاور کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا...... ثبوت بھی موجود تھا...... گواہ بھی موجود تھے دلاور کو چودہ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی...... کچھ دن کُسم کے طعنے سن سن کر وہیں پر کاٹے ایک دن ایک ضعیف العمر پڑوسی کچھ دن کُسم کے پاس آیا اور بولا: ''بیٹی!! مجھ سے تیری

یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تو اپنے میکے کیوں نہیں چلی جاتی'' یہ سنتے ہی کُسم کو امید کی ایک کرن نظر آئی لیکن مجھے کون لے جائے گا۔ آخر یہ بوڑھا کس دن کام آئیگا، بوڑھے نے پتہ وغیرہ کُسم سے لیا اور دونوں وہاں سے چل دیئے گاڑی سے اُترنے کے بعد وہ ٹانگے میں سوار ہو گئے ٹانگہ ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رکا'' بابا! یہ کونسی جگہ ہے'' کُسم اچانک پوچھ بیٹھی'' بیٹی! تیری ماں آج کل یہیں پر رہتی ہے'' بابا! آپ کا احسان میں کبھی نہیں بھولوں گی''۔

کُسم کو عجیب سا محسوس ہوا وہ ایک کمرے سے دوسرے میں ماں ماں پکارنے لگی۔ وہ واپس ہال کی طرف بڑھی تو اس کے کانوں سے بوڑھے شخص کے یہ الفاظ ٹکرائے'' ارے سونا بائی۔ پوری سونے کی کان اٹھالایا ہوں۔ تیرا بڑھاپا آرام سے کٹ جائے گا''۔ کُسم کے کانوں میں طبلے سارنگی اور گھنگروں کی ملی جلی آواز گونجنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی میں پھنس گئی ہو۔

...........☆☆☆...........

صابُن کی ٹکیا

مہینے کی آخری تاریخ کو جب دودھ والے نے آکر کہا، بابو جی! میں نے کل گائے بیچ دی ہے اسلئے صبح سے دودھ نہیں لاسکوں گا تو میں فکر مند ہو گیا۔ اسی سوچ میں گھرا بیٹھا تھا کہ چھوٹو دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا، انکل جی آپ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ کیا بتاؤں یار! ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں، انکل جی بتایئے تو سہی؟ چھوٹو یہ مسئلہ شاید تم سے حل نہ ہو سکے، اف او بتایئے تو سہی؟ یار وہ! وہ کیا ہے کہ کل دودھ والے نے جواب دے دیا ہے صبح سے بنا دودھ کے چائے پینی پڑے گی۔ چھوٹو نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا..........بس اتنی سی بات؟ ارے یہ کیا اتنی سی بات ہے؟ اور نہیں تو کیا..........! یہ مسئلہ میں یوں حل کر سکتا ہوں، ''چھوٹو'' نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا .... ''وہ کیسے؟ چھوٹو نے کمرے کا ایک چکر لگایا اور دفعتاً اچھل پڑا..........''مل گیا..........مل

گیا.........کیا؟ میں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا، مسئلے کا حل! بتاؤ تو......؟ ارے انکل یہاں پاس میں ہی ایک پنڈت چرواہا رہتا ہے اسے کہہ دیں گے دودھ مل جائے گا ....چھوٹو کا حل سن کر میں سوچنے لگا میں بھی کس مسئلے کو لے کر صبح سے پریشان تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بول پڑا، لیکن انکل ایک شرط ہے! شرط؟ کیسی شرط؟ میرا دل کسی انجانے خوف سے گھبرانے لگا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں! بات دراصل یہ ہے کہ دودھ لانے کے لئے آپ کو وہاں خود جانا پڑے گا۔ شرط سُن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھینکس گاڈ! اچھا انکل مجھے اسکول جانا ہے اگر پنڈت نے دودھ دینے سے انکار کیا تو مجھے بتانا میں پاپا سے فون کرادونگا" اس کے اس مذاق پر میں نے زوردار قہقہہ لگایا پر چھوٹو جا چکا تھا ...."

صبح پرندوں کی چہچہاہٹ سے جب میری آنکھ کُھلی تو کھڑکی کی جُھریوں سے آفتاب کی کرنیں چھن کر اندر داخل ہو رہی تھیں، میں نے انگڑائی لی تو فوراً یاد آیا کہ مجھے چرواہا کے ہاں دودھ لانے جانا ہے۔ میں نے جلدی جلدی بستر چھوڑا اور لوٹا اٹھا کر سامنے والی گلی کی سمت چل پڑا.........."، چھوٹو کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق چرواہے کا گھر یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں ایک ایک گھر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرے کان ادھر ادھر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے کہ کسی طرف سے بھیڑ بکریوں کی آواز آئے تو چرواہے کا گھر مل جائے.........ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی راہگیر سے پوچھوں اتنے میں ایک عمر رسیدہ شخص میلے سے دھوتی

کرتے میں ملبوس ، ماتھے پر لمبا چندن کا ٹیکا لگائے اور ہاتھ میں سات دھاتی لوٹا لیے میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ مجھے غور سے دیکھنے کے بعد بولا، بابو جی اس علاقے میں نئے لگتے ہو؟ ہاں میں وہاں سانڈے رام جی کے ہاں کرائے دار ہوں۔ کیا آپ بھی لیڈر ہیں؟ اس کے طنزیہ سوال پر میں فوراً بول اٹھا، نہیں، نہیں، میں کوئی لیڈر ویڈر نہیں ہوں........... ''اچھا تو آپ بنئے ٹھہرے ہونگے۔ جی میں بنیا بھی نہیں ہوں.......... شکر ہے آپ ان دونوں میں سے نہیں ہیں۔ کیونکہ لیڈر تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ ان لیڈروں نے ہی تو کرسی کی لالچ میں دیش کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ الیکشن کے دوران تو ہمیں مائی باپ کہتے ہیں اور ووٹ بٹورنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں لیکن الیکشن جیتنے کے بعد ہمیں پہچانتے تک نہیں........... ''اپنے کئے ہوئے وعدوں کہ فہرست تک بھول جاتے ہیں۔ ان لیڈروں سے بچ کر رہنا یہ کافی شاطر اور خطرناک ہوتے ہیں اور بنئیے........... ! بنئیے تو کھٹمل ہیں کھٹمل ....

باپ دادا کا بیاج چُکاتے چُکاتے آدمی شمشان پہنچ جاتا ہے پر بیاج ختم نہیں ہوتا .... انسانوں کا خون چوس چوس کر ہاتھی کی طرح موٹے ہو جاتے ہیں۔ غریبوں کی آہیں اور آنسو روپیوں کی شکل میں تجوری میں بھر کر رکھتے ہیں۔ پھر بھی نہ چین سے سوتے ہیں اور نہ ہی پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ بس جوڑتے جوڑتے ہی مر جاتے ہیں۔ بھئی میرا تو ان بنئیوں اور سیاسی لیڈروں پر سے بھروسہ ہی اٹھ گیا ہے اس کے منہ سے لیڈروں اور

بنئیوں کی تعریف سنکر مجھے محسوس ہوا کہ اس بیچارے نے کافی ستم جھیلے ہیں وہ تھوڑا باتونی ضرور تھا لیکن جتنی بھی باتیں کی مطلب کی تھیں۔

آپ کیا کام کرتے ہیں؟ وہ پھر پوچھ بیٹھا، جی میں بھی ایک این، جی، او کا ورکر ہوں۔ کس محکمے سے ہیں؟ جی میں حقوق انسانی تنظیم کا ایک کارندہ ہوں.......... یہ کون سا محکمہ ہے؟ اس کا کام کیا ہے؟ اس تنظیم کا کام یہ دیکھنا ہے کہ کسی جگہ انسانی حقوق کی پامالی تو نہیں ہو رہی ہے اس جمہوری دیش میں ہر شخص کو اپنا حق مل رہا ہے کہ نہیں؟ یوں سمجھ لیجئے کہ انسانی حقوق کے محافظ ہیں .... چلو اچھا ہوا آپ اس علاقے میں پہنچ گئے اب آپ خود ہی دیکھ لیں گے کہ کہاں پامالی نہیں ہو رہی ہے.......... "میرے ہاتھ کے لوٹے پر نظر پڑتے ہی وہ پوچھ بیٹھا.......... آپ کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟ جی میں وہ .... دراصل چھوٹو نے مجھے بتایا تھا کہ اس طرف کوئی چرواہا رہتا ہے جو دودھ بیچتا ہے۔ مجھے بھی دودھ لینا تھا۔ لیکن یہاں کسی جانب سے بھی بھیڑ۔ بکریوں کے بولنے کی آواز سنائی دی جس نے اندازہ لگایا جائے کہ کون سا گھر ہے .... "میری باتیں سن کر وہ ہنس پڑا .... ارے بابو وہ چرواہا تو آپ کے سامنے کھڑا ہے، کیا؟ یہ سنکر میں شرمسار ہوا .... آیئے وہ سامنے ہی میرا گھر ہے، بھیڑ بکریوں کی آواز اس لئے سنائی نہیں دی کیونکہ وہ مکان کے پچھواڑے میں ہیں آیئے آیئے آپ دودھ لے لیجئے، اس کی آواز پر ایک بیس سالہ لڑکی باہر آئی .... بابو جی یہ میری بیٹی چمپا ہے.......... اس نے میرا تعارف بیٹی

سے کراتے ہوئے کہا، یہ بابو جی ہیں! پاس ہی میں رہتے ہیں! حقوق انسانی کی تنظیم سے وابسطہ ہیں، اب یہاں سب کا دکھ درد بانٹیں گے، لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھیں گے، میں لڑکی کو ایک ٹک دیکھتا رہا اس کا حسن کیچڑ میں کھلے کنول کی طرح مہک رہا تھا، اس نے شرمیلے انداز سے میرے لوٹے میں دودھ انڈیل دیا اور اندر چلی گئی، میں نے بھی کل پھر آنے کا وعدہ کر کے گھر کی راہ لی ....گھر پہنچ کر میری آنکھوں کے سامنے اس پنڈت چرواہے کا گھاس پھوس کا بنا ہوا چھونپڑا رقص کرنے لگا اس کی میلی دھوتی اور کرتا مجھے رہ رہ کر ستا تا۔ میں خدا کی کاریگری پر حیران تھا جو دولت محلوں میں اور خوبصورتی جھونپڑوں میں عطا کرتا ہے پنڈت کی بیٹی ان پڑھ ضرور تھی لیکن اس کی خوبصورتی دیکھنے والے کو بے حد متاثر کرتی تھی یہی اس کا مثبت پہلو تھا ورنہ اس مادہ پرستی کے دور میں بغیر جہیز کے اسے کون اپناتا؟ میں اس کے متعلق جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا جاتا ....رفتہ رفتہ میں نے اپنے سروے رپورٹ تکمیل کے آخری مراحل تک پہنچادی تھی۔ دن یونہی گزرتے گئے میں ہر صبح دودھ لانے جاتا اور روز چمپا ملتی پھر کچھ دنوں کیلئے وہ نانا کے ہاں چلی گئی۔ ایک شام جب میں شہر سے لوٹ رہا تھا کہ سامنے کے میدان میں میری نظر بھیڑ بکریاں چراتی چمپا پر پڑی۔ اس نے وہی میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور پیروں میں نائلن کی گھسی ہوئی چپل ....مجھے دیکھتے ہی بولی، بابو جی نمستے! ....نمستے نمستے کب لوٹی ننھال سے؟ میں نے نمستے کا جواب دینے

کے فوراً بعد پوچھا، کل شام کو! لیکن بھیڑ بکریاں تو یہیں پر تھیں۔ آپ کو دودھ تو ملتا رہا نا؟ ہاں ہاں .... ارے یہ کیا تم نے ابھی تک وہی کپڑے پہن رکھے ہیں؟ ہاں بابو جی! میں تو ننھال بھی یہی پہن کر گئی تھی یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا، میں کہہ اٹھا، لیکن ان میلے کچیلے کپڑوں میں تمہارے حسن کی چمک مانند پڑ جاتی ہے۔ تم اتنی سندر ہو۔ اچھے ڈریس میں تم اور بھی پر کشش لگو گی۔ کم از کم صابن سے اچھی طرح دھو لیا کرو ....! جب صابن ہی نہیں! کیا؟ ہاں بابو جی! پتا جی نے ابھی تک بنیئے کا پچھلا بیاج نہیں چکایا وہ صابن کیسے دے گا۔ مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آئی ....ارے پگلی میرے ساتھ آؤ کتنی صابن چاہیے، کیا آپ کے پاس صابن ہے؟ ہاں ہاں ہمارے پاس تو ڈھیر ساری صابن ہے! کیا اس سے میرے کپڑے صاف ہو جائیں گے؟ ہاں ہاں کیوں نہیں! اس سے تو تمہارا جسم بھی صاف ہو جائے گا! سچ؟ بابو جی آپ کا گھر کہاں ہے؟

وہ ہاں اس برگد کے پاس......... چلیئے پھر ابھی چلتے ہیں......وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی میرے ساتھ ہو لی، گھر پہنچ کر میں نے صابن کی ایک ٹکیا اسے تھما دی۔ وہ صابن ہاتھ میں لیتے ہی اس قدر خوش ہوئی کہ بغیر شکریہ ادا کئے ہی وہ وہاں سے بھاگ گئی.........اب تک اس علاقے کے تعلق سے میری معلومات میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ چند لوگوں پر مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا جو ان بھولے بھالے لوگوں کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے ان میں لیڈر اور بنیا اہم تھے......... کچھ دنوں کے بعد وہ پھر

ملی تو وہ کھلی کھلی سی لگ رہی تھی۔اس کے بال ملائم ہو چکے تھے اور ہوا سے محو گفتگو تھے۔وہ خود ہی بول اٹھی، بابو جی! آپ کا دیا ہوا صابن تو ختم ہو گیا .... مجھے اس کی باتوں پر پھر ہنسی آئی۔وہ خوش نظر آ رہی تھی۔میں نے کہا" کوئی بات نہیں اور دیں گے جب ضرورت ہو آ جانا........."سچ بابو جی؟ ہاں ہاں بالکل سچ! تو پھر مجھے آج ہی ضرورت ہے چلئے دیجئے....."
اس کی بے باک باتوں سے میرے جسم میں عجیب سی حرکت ہوئی۔میں نے اپنے سر کو جھٹک دیا۔وہ ہاتھ میں درخت کی پتلی ٹہنی لے کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔اس کی خواہش پر میں انکار نہ کر سکا۔کیونکہ سماج میں پھیلی ہوئی گندگی اور انسانی ذہنوں اور اجسام کی میل صاف کرنا ہی تو میرا کام تھا۔لوگوں کے رستے ہوئے ناسور کی مرہم پٹی کرنا ہی میرا فرض اولین تھا۔لیکن اس کیچڑ کو صاف کرنے کے لئے اس کیچڑ میں اترنا پڑا........ہم دونوں کمرے میں داخل ہو گئے وہ چارپائی کے کونے پر بیٹھ گئی۔گرمی کی وجہ سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔میں پانچ چمچ گلوکوز پانی کے گلاس میں ڈال کر ہلانے لگا تو چمپا نے بڑھ کر گلوکوز کا ڈبہ اٹھا لیا غور سے دیکھنے کے بعد بولی، بابو جی یہ کیا ہے؟ میں نے کہا گلوکوز اور ہاتھ بڑھا کر ڈبہ لینے لگا اسے چھوتے ہی میرے سارے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا اور اس پر بھی عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اس کی آنکھوں میں مستی ٹپکنے لگی۔
مجھے فوراً چھوٹو کا خیال آیا میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر دروازے کے کواڑ بند کر دیئے۔گلوکوز کا گلاس حلق میں اتارنے کے بعد میرے ہاتھ حرکت

میں آ گئے۔ دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر کوئی پیاسا رہ جائے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ شرم سے سمٹے ہوئے بولی، بابو جی یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے اس کے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا تمہارے جسم کی میل اتار رہا ہوں۔

اب میرے اندر کا حیوان پوری طرح جاگ چکا تھا۔ تھوڑی آنا کانی کے بعد وہ موم کی طرح پگھل گئی تو میں نے بھی تھوڑی محنت کے بعد اس کے جسم سے ساری میل اتار دی۔ اس کے اظہار سے ظاہر تھا کہ اس نے بھی عجیب سے لذت محسوس کی تھی۔ سامنے کے آئینے پر نظر پڑتے ہی میں اپنے عمل شرمندہ ہو گیا لیکن اب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جانے سے پہلے میں نے اس کو صابن کی ایک ٹکیا دی تو وہ ٹکیا کو دیکھتے ہوئے مخاطب ہوئی، بابو جی! میرے جسم کی ساری میل تو آپ نے اتار دی۔ اب اس کی کیا ضرورت ہے۔؟

............☆☆☆............

سحرِ نو

رات کے مہیب سائے اس کے وجود میں مگرمچھ کے نوکیلے دانتوں کی مانند پیوست ہو چکے تھے۔ اس نے ایک طائرانہ نظر اپنے سامنے پھیلے ہوئے وسیع صحرا پر ڈالی۔ مہتاب نے دیواروں کے پیچھے سے سر ابھار کر لہروں کے وجود پر سُریلا نغمہ چھیڑ دیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ یہاں سے اپنی منزل کی جانب قدم بڑھاتا تھا۔ کیونکہ دن کے اُجالے میں بدروحیں گدھوں کی مانند شہر کے چپے چپے پر پہرہ دے رہی ہوتیں۔

لیکن رات کے اندھیرے میں وہ اپنی کمین گاہوں میں گھس کر آرام کرتیں۔ مہتاب کی مدھم روشنی میں اس نے اپنے اردگرد ہاتھوں سے کچھ ٹٹولا پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر کھڑا ہوا اور ایک تھیلہ اٹھا کر جانب منزل چل دیا............ یہ کام وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اوروں کے لئے کر رہا تھا۔ وہ اس شہر کے لوگوں کو روشنی دکھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کی کتنی ہی پشتیں یہاں کی سنگلاخ دھرتی کو اپنے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر لہولہان

کر چکی تھیں۔ پھر بھی انہیں وہ حقوق حاصل نہیں تھے جن پر ان کا پورا اختیار تھا۔ ان کی جان توڑ محنت سے ہی یہ بنجر دھرتی آباد ہوئی تھی مگر ان سب کی خوشیوں کا، ارمانوں کا اور محنتوں کا انجام اتنا دردناک ہوگا، اس سے وہ بالکل بے خبر تھے اور اسی بے خبری کے عالم میں لمبے سایوں نے ان سے سب کچھ چھین لیا۔ سب کچھ۔ ان کا ورثہ، ان کی شناخت، ان کا ماضی اور ان کا درخشاں مستقبل، جس پر انہیں ناز تھا۔ انہیں ان لمحات سے بھی محروم کر دیا گیا جن پر ان کا بنیادی حق تھا۔ ان سے ایک ایک چیز چھین لی گئی۔ ایک خاص قسم کی سیاہی سے ان کے انگوٹھے قلم کو دیئے گئے ان کے اجسام سے ان شاخوں کو بھی ایک ایک کر کے کاٹ ڈالا گیا جنہیں انہوں نے بیس برسوں تک اپنے خون سے پالا تھا۔ آخر اتنا کچھ کرنے کے باوجود انہیں حاصل کیا ہوا............؟ غلامی، بھوک، پیاس، ذلت، رسوائی، تہمتیں، اندھیرے میں گھری خندقیں، جن میں ان کے ارمان سسک سسک کر دم توڑ گئے۔ اب تو صرف ایک دیا بچا تھا۔ صرف ایک دیا، وہی دیا جو ہمیشہ دوسروں کو روشنی دیتا تھا۔ جس کے اپنے پہلو میں سدا اندھیرا رہتا ہے۔ یہی وہ دیا تھا جو اس شہر کے گھنے اندھیروں سے تنہا لڑنے کا حوصلہ رکھتا تھا اُس کا ذہن خلاؤں میں محوِ پرواز تھا۔ اس کا وجود آبِ زم زم کی طرح بالکل پاک تھا وہ ہواؤں کے دوش پر فرشتوں سے محوِ گفتگو تھا۔

صرف اس لئے کہ وہ اس شہر میں روشنی کی ایک کرن لانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ آنے والی اس روشنی سے فیض یاب نہیں ہو سکے گا۔

کیونکہ آفتاب کے آگے دیئے کی کیا بساط؟ وہ اس شہر کے لوگوں تک ہمت
بھرا پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔ انہیں غلامی کا احساس دلانا چاہتا تھا، کہنے کو تو اس
شہر میں روز ہی سورج نکلتا تھا لیکن اس کی شعاعوں کو لمبے سائے طاقت
کے بل بوتے پر آہنی پنجرے میں قید کرلیا کرتے تھے۔ تاکہ اس روشنی کی
کرنیں اس شہر کے مردہ ذہنوں تک نہ پہنچ سکیں۔ تاکہ کرنوں کے نیزے
ان کے مردہ ضمیر کو ذلت اور غلامی کا احساس دلا کر بیدار نہ کردیں۔ لیکن مردہ
غلاموں کی نظر تو اس دیئے پر ٹکی ہوئی تھی جس کا اپنا تیل رفتہ رفتہ ختم ہو رہا
تھا۔ وہ اس روشنی کی ایک کرن کا متمنی کیوں تھا؟ صرف اس لئے کہ ان
اندھیروں کی غلامی اسے منظور نہیں تھی۔

ذلت کی زندگی گوارہ نہیں تھی۔ وہ گھٹ گھٹ کر جینا نہیں چاہتا
تھا۔ اس کا ضمیر ہر وقت اسے کچوے لگاتا رہتا کہ تم مجھے خاموشی کے
اندھے کنویں میں دفن کیوں کرنا چاہتے ہو؟ کیا اماوس کی کالی رات کے
نصیب میں پونم کا ملاپ ممکن نہیں؟ یہاں کے بزدل لوگوں کی طرح تم بھی
اپنے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کرانا چاہتے ہو؟ کیا تمہیں اپنے وجود کا
بالکل احساس نہیں ہے؟ جو لوگ تمہیں دن کے اُجالے میں اپنے لمبے
سایوں سے خوفزدہ کرتے ہیں دراصل وہ سب تم سے بونے ہیں؟ اپنے
ضمیر کی آواز سن کر اس کے مردہ جسم میں جان آجاتی، اس کی سوچ کے
پودے سر اٹھانے لگتے، پھر اس نے روشنی کا سراغ لگانا شروع کردیا، ایک
دن جب وہ بدروحوں کے قفس میں زنجیروں سے جکڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

کراہتے کراہتے وہ نیند کی آغوش میں سما گیا۔ تو اس نے دیکھا کہ اس بڑے پہاڑ کے عقب میں روشنی کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ وہاں کے لوگ آزاد ہیں۔ بالکل آزاد۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ خوشی ان کا طواف کر رہی ہے۔ اناج کے کھیت لہلہاتے ہیں۔ سرسبز گھاس پر اوس کے موتی چمک رہے ہیں۔ اونچے اونچے پربتوں سے جھرنے گر رہے ہیں۔ وہ عمر کی سیڑھی کے اس پائے پر تھا۔ جہاں اسے اپنی مرضی سے خواب دیکھنے کا پورا اختیار تھا۔ ابھی وہ اس خلد بریں کی سیر ہی کر رہا تھا کہ اتنے میں بدروحوں کے سردار نے بھاری بھرکم جوتے کی نوک سے ٹھوکر مارتے ہوئے اسے جگا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا" اے ابن آدم! ازل سے اب تک جو لکیریں تمہارے اجداد نے کھینچی ہیں انہیں بدلنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ کوئی فلسفہ، کوئی بھی نظام حیات ان لکیروں کو بدلنے سے قاصر ہے۔ ہاں تھوڑی دیر کے لئے امیدوں کا غبار بن کر ان کا احاطہ ضرور کر سکتا ہے۔ مگر آسمانوں سے اترتی ہوئی آندھیاں اس غبار کو پل بھر میں اڑا کر اپنے ساتھ بہت دور لے جائیں گی اور پھر سب کچھ عکس آئینہ کی مانند ٹھہرے ہوئے منظر کی تفسیر بن جائے گا۔ تم سے پہلے بھی کئی لوگوں نے موم کی پنکھ لگا کر سورج کو چھونے کی سعی کی تھی۔ ان کے انجام سے تم بخوبی آشنا ہو۔ جواب میں اس نے اپنے زنجیروں میں جکڑے ہوئے جسم کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا، اے بدروحوں کے سردار! وہ وقت چلا گیا جب ہمارے افکار و عقائد جہالت کے دھندلکوں میں ڈوب

چکے تھے۔ لیکن اب ہماری سوچ کے پودے پوری طرح جوان ہو چکے ہیں۔ جنگ بدر اور جنگ احد کے واقعات سے گزر چکے ہیں۔ اب ہمیں کربلا کی پیاس کا اندازہ ہو چکا ہے ابن مریم کی نصیحتوں سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ خون کا دریا دیکھتے دیکھتے ہماری آنکھیں پتھرا گئیں ہیں۔ تربتوں پر کتبے لگاتے لگاتے ہمارے ہاتھ شل ہو چکے ہیں۔ ایک مدت سے نسل باطل سے نبرد آزما ہیں۔ بلاشبہ اب ہمیں لشکرِ ایوبی کی طاقت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی ہم ابابیلوں کے لشکر کے محتاج ہیں۔ آج ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ ہماری رہائی کوہساروں کی مخروطی چوٹیں سے ہمیں صدائیں دے رہی ہے۔ اپنی باہیں پھیلا کر ہمارے بڑھتے قدموں کو خیر مقدم کہہ رہی ہیں۔ اب تک ہم استدلال کی بیساکھیوں پر بھروسہ کر رہے تھے۔ اب ہم نے لفظوں کے تہہ در تہہ معنی پر قبضہ جما لیا ہے۔ آج عرفان و آگہی کی شمعوں سے ہمارا سینہ روشن ہو چکا ہے یاد رکھ اے بدروحوں کے سردار! مظلوم کی ایک صبح ضرور ہوتی ہے اور تب ظالم کا وجوُد گمنامی کی کھائی میں دفن ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ قدرت کی لازوال کتاب میں تحریر ہے۔ اس تحریر سے ہم اچھی طرح آشنا ہو چکے ہیں۔ جبھی تو ہم بدروحوں سے برسرِ پیکار ہیں!!!

ہاہاہاہا............ارے آدم تم جو بھی کرنا چاہو کر لو، مگر ان اندھیروں سے فرار ممکن نہیں۔ وہ تب ہی ممکن ہے جب آفتاب بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہوگا۔ بدروحوں کے سردار تمہاری یہ خواہش بھی بہت جلد

پوری ہو جائے گی۔ یہ سورج ایک دن ضرور مغرب سے نکلے گا انشاء اللہ.......... اور پھر اس نے اندھیروں کی غلامی نامنظور کر دی۔ بدروحوں کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ ساری رات اس کا وجود اذیتوں کی چکی میں گیہوں کی طرح پستا رہا۔ جو اس کے انکار کی وجہ بنی۔ اس کے ناخن گوشت سے جدا کر دیئے گئے مگر وہ اپنے ارادے پر اٹل رہا۔ کیونکہ اس ایک کے بیعت کرنے سے ساری قوم غلامی کے دلدل میں پھنس جاتی۔ دوسری صبح اسے ریگستان کی تپتی ہوئی ریت پر جھلسنے کیلئے پھینک دیا گیا۔ جہاں اسے مردہ سمجھ کر اس پر گدھ منڈلانے لگے۔ وہ اس کی بوٹی بوٹی نوچ کر کھا جاتے کہ اسی وقت ایک درویش صفت سایہ سفید خلعت میں ملبوس وہاں وارد ہوا اور اپنی مشک سے اسے پانی پلانے کے بعد مخاطب ہوا۔ اے آدم زاد! بربریت کی انتہا ہو چکی ہے ظلم کے بادل چھٹنے والے ہیں۔ مظلومیت کا آفتاب طلوع ہونے والا ہے۔ اب بدروحیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ تمہارا حوصلہ بلند ہے۔ تمہارا ارادہ مستحکم ہے۔ تم ضرور ایک دن آفتاب بن کر ابھرو گے اور اپنی ضیاپاشیوں سے باطل کی تاریکیوں کو نیست و نابود کر دو گے۔

یہ الفاظ سن کر اسکے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ پھر اسے معلوم نہیں کہ وہ کس طرح اس پہاڑ تک پہنچا۔ جس کے پیچھے اس نے روشنی کا ایک بڑا ذخیرہ دیکھا تھا۔ شگاف کرنے کے لئے اس کے پاس اوزار کہاں سے آئے اسے کچھ علم نہیں .... مسلسل ساٹھ سال تک وہ

برگزیدہ ہستیوں کے سینے پر ظلم کے ہل چلتے دیکھتا رہا۔ اپنے آباواجداد کی سرزمین پر زہر اور خون کی فصلیں اگتے دیکھتا رہا۔ لیکن اب اسے روشنی کا سراغ مل چکا تھا۔ پہاڑ کے سینے میں شگاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ لہولہان ہو چکے تھے اس کا چہرہ جھریوں کے جنگل میں ڈوب چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے دیئے مدھم ہو چکے تھے۔ اس کے جسم پر گوشت برائے نام رہ گیا تھا۔ خون کی مقدار بھی کم ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اس کے سینے میں امید کی ایک شمع صنوفشاں تھی۔ اب وہ روشنی سے چند گز کے فاصلے پر تھا اس کے ہاتھ اوزار اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ لیکن اس یقین کے ساتھ کہ کل کا آفتاب نئی روشنی لے کر نمودار ہوگا۔ وہ آہستہ آہستہ اوزار چلاتا رہا۔ اندھیرے کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا رہا، رات سسک سسک کر دم توڑتی رہی پتہ نہیں کس پہر دفعتاً روح کی بوڑھی فاختہ اپنی آنکھوں میں انتظار کی شمع جلائے دور آسمانوں کی نیلا ہٹوں میں پرواز کر گئی۔ پہاڑ کے دوسری جانب سے روشنی اس شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ تمام لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے اور پھر اس کے نام کے فلک شگاف نعرے فضا میں گونجنے لگے تھے۔ آفتاب آج بھی طلوع ہوا تھا مگر ایک خوشگوار تبدیلی کے ساتھ۔

............☆☆☆............

مُحسن

رحمت اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا تھا کہ اس نے نواب خاندان میں جنم لے کر دنیا کے سارے سُکھ اپنے نام کرا لئے ہیں۔ وقت نے رحمت کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا کہ وہ چاروں خانے چت ہو گیا۔ گاڑی کے ایک حادثے میں اس کے باپ کی موت ہو گئی۔ عادل خان کی شریک حیات جو پہلے ہی دل کی مریضہ تھی یہ صدمہ وہ برداشت نہ کر سکی اور ایک ساتھ گھر سے دو جنازے نکلے.......... یہ خبر جب رحمت خان نے ایک پارٹی میں سنی تو اس کا نشہ ہوا ہو گیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر زوردار ہتھوڑا دے مارا ہو۔ والدین کی بے وقت موت نے رحمت کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا.......... کاروبار کے بارے میں اسے کوئی جانکاری نہ تھی۔ اس پر اچانک مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن افشاں پڑھی لکھی اور شائستہ تھی اس نے رحمت کو بکھرنے نہیں دیا۔ بلکہ سارا

کاروبار سنبھالنے میں اس کی بھرپور مدد کی ....رفتہ رفتہ رحمت نے کاروبار سنبھال لیا اور پھر پوری طرح اس میں منہمک ہو گیا۔ افشاں پانچ وقت خدا کی بارگاہ میں شکر ادا کرتی کہ اس نے رحمت کو سیدھی راہ دکھائی تو وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگا۔ وہ بے حد خوش تھی ....رحمت صبح گھر سے نکلتا اور رات دیر سے گھر لوٹتا۔ پوچھنے پر وہ یہی جواب دیتا کہ کاروبار پھیل رہا ہے وقت تو دینا ہی پڑے گا۔ وہ کاروبار میں اس قدر محو ہو گیا۔ افشاں کو لگا وہ اپنے رحمت کو کھونے لگی ہے ایک طرح سے وہ خوش بھی تھی کہ رحمت کاروبار میں پوری طرح دلچسپی لینے لگا ہے۔

مرزا اور ببن میاں رحمت کے کالج کے یار تھے۔ عیش پرستی اور آوارگی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کو پہلے ہی کنگال کر چکے تھے اور اب رحمت کے اتنے قریب آچکے تھے کہ دفتر کے اندر ہی شراب کی محفل جمی رہتی۔ جب مرزا نے دیکھا کہ رحمت خان ان کی مکاری کے جال میں پوری طرح پھنس چکا ہے تو ان دونوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ وہ دونوں تو پہلے سے ہی کوٹھوں پر جانے کے عادی تھے۔ ایک دن وہ دونوں حسن بانو کے کوٹھے پر مجرہ سننے گئے لیکن جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ذلت اٹھانی پڑی۔ حسن بانو واقعی حسن کی ملکہ تھی وہ اس بازار کی مشہور طوائف تھی۔ اس نے مرزا اور ببن کو اپنے کوٹھے سے بغیر مجرہ سنے ہی لوٹا دیا۔ لیکن دوسرے ہی دن مرزا اور ببن میاں حسن بانوں کے ہاں ایک تجویز لے گئے مرزا بولا" حسنہ ہم ایک کروڑ پتی تاجر کو تمہارے

پاس لا رہے ہیں۔ وہ بے حد عیش پرست ہے وہ تم جیسی حسین وجمیل پر لاکھوں روپے نچھاور کرسکتا ہے۔لیکن ہماری ایک شرط ہے" مرزا منہ میں پان ڈالتے ہوئے بولا" وہ کیا بھلا؟ حُسن بانو کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ببن میاں اپنی ترچھی ٹوپی کو درست کرتے ہوئے بولا" وہ یہ کہ اس میں ہمارا برابر کا حصہ ہوگا' حسنہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی ٹھیک ہے! اگر تمہیں دلالی ہی کھانی ہے تو تمہیں تمہارا حصہ ضرور ملے گا۔"

یہ ہوئی نہ بات! ببن میاں کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا، لیکن حسنہ ایک بات کا خیال رکھنا، مرزا سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا، وہ کیا؟ حسنہ تذبذب میں پڑ گئی، اس کام میں تھوڑی چالاکی اور ہوشیاری کی ضرورت ہے! ببن میاں نے مطلب کی بات کی، بس اتنی سی بات؟ حسنہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا، اس کی آپ بالکل فکر مت کرو حسن بانو نام ہے میرا، میں تو اداکاری کی مثال ہوں جو اس کوٹھے پر آتا ہے پھر یہاں سے جانے کی تمنا ہی کرسکتا ہے۔

بازار میں چہل پہل شروع ہوگئی تو مرزا اور ببن میاں بھی صبح سویرے ہی رحمت خان کے دفتر میں پہنچ گئے۔" ارے رحمت میاں تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو۔کئی دنوں سے نظر ہی نہیں آے! مرزا مسکالگاتے ہوئے بولا، اماں یار ہم تو یہیں اپنے دفتر میں فائلوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے بور ہو رہے ہیں، عید کا چاند تو آپ ہو گئے ہیں۔رحمت نے فائل بند کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔لو بھئی اب تو نظر آ گیا منا لو عید! ببن

میاں سرخ دانت نکالتے ہوئے بولا، پھر کیا تھا رحمت خان نے کاغذ قلم اور فائلیں ایک طرف رکھ دیں اور عید کا جشن شروع ہو گیا۔ شراب کی محفل جم گئی اور ساتھ میں تاش کے پتے بھی ہاتھوں میں آ گئے.......... جب مرزا نے دیکھا کہ محفل پوری طرح رنگ میں آ گئی ہے تو بول پڑا، رحمت میاں شباب کے بغیر شراب کی محفل ادھوری ہے! کیوں نہ آج شباب اور شراب کا ملاپ ہو جائے! خدا قسم بڑا مزا آئے گا۔ ارے آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ ببن میاں بیچ میں ٹپک پڑا، پھر دیر کس بات کی، رحمت خان مدہوشی کے عالم میں بڑبڑایا، چلو پھر حسن بانو کے کوٹھے پر چلتے ہیں جہاں شباب ہی شباب برستا ہے۔ مرزا نے رحمت کی باہوں میں بانہہ ڈالتے ہوئے کہا، پھر تینوں حسن بانوں کے کوٹھے پر پہنچ گئے۔ دروازے پر دربان کھڑا تھا، سلام حضور! اس نے سر خم کرتے ہوئے کہا، منصوبے کے مطابق مرزا نے سو سو کے پانچ نوٹ اپنی جیب سے نکال کر دربارن کی طرف بڑھائے۔ ببن نے بھی ایسا ہی کیا، ان دونوں کی دیکھا دیکھی رحمت خان نے بھی اپنی جیب سے انگنت نوٹ نکال کر دربان کی طرف بڑھائے۔ مرزا کہہ اٹھا، اماں یہ ہمارے نواب صاحب ہیں۔ جتنے بڑے رئیس ہیں اتنے ہی دل کے بھی بڑے ہیں، جاؤ عیش کرو! دربان نے پھر سر جھکا کر سلام کیا پھر تینوں کوٹھے کے اندر داخل ہو گئے۔ جہاں پہلے ہی حسن بانوں چلمن میں چہرہ چھپائے برق گرانے کی تیاری میں تھی۔ رحمت کا نشہ اتر چکا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی رقص شروع ہو گیا ساتھ میں نوٹوں کی بارش بھی شروع ہو گئی۔

دوران رقص حسنہ نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹایا تو سچ مچ محفل میں بجلی کوند گئی اور برسات ہونے کے بجائے بدلی سے چاند نکل کر ساری محفل کو اپنے نور سے منور کرنے لگا۔ نواب رحمت خان اٹھ اٹھ کر نوٹ نچھاور کر رہا تھا جب روپے ختم ہو گئے تو نواب صاحب بغلیں جھانکنے لگا۔ اچانک ان کی نگاہ انگلی میں پہنی ہوئی اس ہیرے کی انگوٹھی پر پڑی جو اسے سسرال والوں کی طرف سے منہ دکھائی کی رسم کے موقع پر دی گئی تھی۔ رحمت خان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً انگلی سے انگوٹھی نکال کر حسن بانو پر وار دی، حسن بانو، ببن میاں اور مرزا کی آنکھوں میں یک لخت چمک آ گئی۔ محفل واہ واہ کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ دفعتاً رحمت خان کھڑا ہو کر گرجدار آواز میں بولا۔ حسن بانو! یہ ہماری توہین ہے! اگر تم چاہتی ہو کہ ہم دوبارہ اس محفل میں نہ آئیں؟ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ مرزا اور ببن نے بھی کھڑے ہو کر تاؤ دکھایا۔ حسنہ ہمارے نواب صاحب تم جیسی لاکھوں رقاصاؤں کو خرید کر غلام رکھ سکتے ہیں! جہاں بھی نواب صاحب جاتے ہیں سارے محفل چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر ان معمولی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر یہ مجرہ سننا کیسے گوارہ کر سکتے ہیں؟ پھر تینوں اٹھ کر کوٹھے سے چلے گئے۔ مرزا نے باہر نکلتے ہوئے حسنہ کو آنکھ کے اشارے سے سمجھا دیا کہ ڈرامہ کامیاب رہا......"

ادھر رحمت کی بیوی افشاں اس کے انتظار میں برابر جاگ رہی تھی۔ اب تو جاگنا اس کا مقدر بن چکا تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے

دروازے پر دستک ہوئی تو افشاں کی جان میں جان آئی۔ اس نے اٹھ کر بڑی چاہ سے دروازہ کھولا تو اس کو یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا کہ روز کی طرح آج بھی رحمت خان نشے میں دُھت ہے، افشاں نے ناک سکوڑتے ہوئے اسے سہارا دیا اور اپنے کمرے تک پہنچایا پھر خود صوفے پر بیٹھ کر اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگی .... صبح کو جب رحمت کی آنکھ کھلی تو آفتاب کافی سفر طے کر چکا تھا، اسے رات کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آئیں.......... اسے ابھی تک تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فون کا ریسور اٹھایا اور منیجر سے کہا، ہیلو! دیکھو آج میں آفس نہیں آ رہا ہوں۔ چابیاں بھیج دوں گا۔ کسی کو پے منٹ کرنا ہو تو کر دینا۔ باقی کا کام بھی دیکھ لینا۔ او کے! پھر اس نے ریسور رکھ دیا (اندھا کیا چاہے دو آنکھیں) منیجر بھی تو یہی چاہتا تھا کہ رحمت خان آفس سے دور ہی رہے جبھی تو وہ سب کچھ دیکھ کر بھی چپ سادھ رہا تھا..........''

مرزا ببن میاں اور رحمت تینوں چائے کے ٹیبل کے گرد بیٹھے زور زور سے کھلکھلا رہے تھے کہ تبھی افشاں وہاں پہنچ گئی انہیں گھور کر دیکھنے لگی۔ مرزا اور ببن میاں جھینپ سے گئے لیکن رحمت فوراً بول اٹھا، اری بیگم کیا دیکھ رہی ہو یہ ہمارے بہت ہی قریبی دوست ہیں۔ دونوں ایک ساتھ بول پڑے۔ بھابی جان آداب! افشاں بغیر جواب دیئے ہی رسوئی کی طرف چلی گئی..........رحمت خان نے روپیوں سے اپنے جیب بھرے مرزا اور ببن میاں کو ساتھ لے کر حسن بانوں کے کوٹھے پر جا

پہنچا.......... حسن بانو آج قیامت ڈھا رہی تھی۔ پھر مجرہ شروع ہو گیا پورے ہال میں صرف تین افراد مجرے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ روپیوں کی رم جھم جاری تھی۔ رحمت خان اس کے حسن اور اداؤں کا دیوانہ ہو چکا تھا۔ مرزا اور ببن میاں نے اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر رحمت خان کی جیبیں ہلکی کر کے وہاں سے رفو چکر ہو گئے.......... حسنہ رحمت کے سر کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ رحمت بھی مستی میں چوُر کہہ رہا تھا، حسنہ ہم نے آج تک تم جیسی حسین وجمیل دوشیزہ نہیں دیکھی۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ یہیں گھر بنا ڈالیں.......... حضور جیسے آپ کی مرضی! میں اور میرا سب کچھ اب آپ کا ہی تو ہے! حسنہ ہم اوروں کے منہ سے تمہارے لئے واہ واہ نہیں سن سکتے، نواب صاحب آج کے بعد اس کوٹھے کے دروازے صرف آپ کے لئے کھلیں گے، ہم نے بھی آپ جیسا حسن کا قدردان نہیں دیکھا، ہم تو آپ کے مُرید ہو گئے ہیں.......... ہمیں آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کی بے پناہ محبت ہی میرے لئے سب کچھ ہے! حسن بانو جذباتی ہوئی جا رہی تھی۔ نواب صاحب یہاں پر بہت سے لوگ آئے اور چوٹ کھا کر گئے لیکن آپ پہلے شخص ہیں جو ہمیں چوٹ دے گئے ہیں.......... دن پر لگا کر اڑتے رہے۔ بہار اور خزاں کی آنکھ مچلی چلتی رہی۔ اس دوران رحمت کے گھر میں ایک اور بیٹے نے جنم لیا۔ لیکن اس کو اپنے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اب تو رحمت کا کوٹھے پر روز کا آنا جانا شروع ہو گیا وہ راتوں کو بھی حسنہ کے کوٹھے پر ہی پڑا رہتا۔ وہ حسن بانوں پر مال متاع لُٹا رہا تھا اور حسن

بانو سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹتی رہی اسے معلوم تھا، کل جب اس کا شباب ڈھل جائے گا تب یہی دولت کام آئے گی۔ اسے تو اپنے بڑھاپے کی لاٹھی مل گئی تھی کسی کا گھر بسے یا اُجڑے اسے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی وہ تو بس زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ ادھر رحمت کی یہ حالت دیکھ کر افشاں بہت پریشان تھی۔ پر بے بس تھی اب رحمت رات کو نیند میں بھی حسنہ حسنہ بڑبڑاتا رہتا۔ ایک دن افشاں نے منیجر سے کاروبار کا حساب مانگا تو منیجر نے حساب سامنے رکھ دیا بنک بیلنس تقریباً ختم ہو چکا تھا جس میں سے منیجر نے بھی خوب اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر پر قرض داروں کی لمبی قطار لگ گئی دفتر پر تالا لگ گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر افشاں کا دماغ گھوم گیا اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اس نے کسی طرح حسنہ کا پتہ معلوم کیا..........''

پھر دوسرے دن وہ اپنے ننھی سے بچّی کو لے کر حسنہ کے کوٹھے پر پہنچی، افشاں کو وہاں دیکھ کر رحمت خان آگ بگولا ہوا اٹھا، تم یہاں کیوں آئی ہو؟ رحمت دانت پیستے ہوئے بولا، جب گھر کا مالک ہی گھر کا راستہ بھول جائے تو مجبوراً بیوی کو ایسی بدنام اور غلیظ جگہوں پر آنا پڑتا ہے، افشاں چلا رہی تھی اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس ننھی سی جان کا بھی تمہیں کوئی خیال نہیں، تمہاری ان ذلیل حرکتوں کا اس کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟ میں اس ڈائن سے ملنا چاہتی ہوں جس نے میرے بسے بسائے گھر کو آگ لگا دی.......... دفعہ ہو جاؤ یہاں سے میرا تمہارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں

ہے۔ رحمت نشے کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے بولا، نشے کی حالت میں تم سب کچھ بھول گئے ہو۔ میں تمہاری بیوی ہوں جسے تم بیاہ کر لائے تھے۔ جسے عام زبان میں شریک حیات کہتے ہیں اور وہ.........وہ ایک ڈائن ہے ڈائن! جس نے نہ جانے کتنے گھروں کا سکون چھین لیا ہے۔ نہ جانے کتنے گھر برباد کر دیئے۔ خدا اسے ایسی سزا دے گا کہ دنیا دیکھے گی۔ رحمت پھر گرجا چلی جاؤ یہاں سے ورنہ دھکے دلوا کر یہاں سے بھیجوں گا.........میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ اپنے گھر چلیئے! آپ میرے سرتاج ہیں، میں آپ کو بد دعا نہیں دینا چاہتی.........خدا سے ڈریئے! اگر میری بد دعا لگ گئی نہ تم رہو گے نہ وہ ڈائن اور نہ یہ کوٹھا، افشاں کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔ یہ سارا تماشہ اوپر کھڑی حسن بانو دیکھ رہی تھی اس کے دل کو زبردست دھچکا لگا۔ اسے افشاں کی حالت پر ترس آگیا وہ بے پنکھ پرندے کی مانند پھڑ پھڑا رہی تھی۔ آج پہلی بار حسن بانو کو احساس ہوا تھا کہ گھر کا اجڑنا کیا ہوتا ہے۔ گھر کا سکون درہم برہم ہونا کیا ہوتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی۔ اس نے رحمت جیسے کتنوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر برباد کر دیا تھا جو اس کی مجبوری تھی۔

افشاں کا ایک ایک لفظ اس کے جگر میں زہریلے نشتر کی مانند اتر رہا تھا حسن بانو کی آنکھوں میں درد کی جھیل جھلملانے لگی، یہ تم نے کیا کر دیا حسنہ! کسی کی جنت سماں زندگی میں اپنی مکاری کا زہر گھول دیا۔ آج پہلی بار وہ خدا کے خوف سے ڈرنے لگی تھی۔ اسے رحمت کے ننھےّ سے بچے پر

بے حد رحم آیا اس نے اپنے پلو سے آنکھیں صاف کر کے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ وہ تیز تیز نیچے اتری پر افشاں جا چکی تھی.........وہ ناکام ہو کر واپس لوٹ آئی۔ رحمت خان جام ومینا سے کھیل رہا تھا۔ نواب صاحب یہ کس عورت سے آپ الجھے ہوئے تھے؟ حسنہ نے انجان بن کر پوچھا''

میری بیوی نے گھر کی نوکرانی کو بھیجا تھا۔ گھر چلنے کی ضد کر رہی تھی.........لیکن وہ تو.........ہاں ہاں اپنی اوقات سے بڑھ کر باتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہی مالکن ہو! رحمت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا''

حسنہ کو رحمت کے منہ سے جُھوٹ سن کر بے حد افسوس ہوا۔ پر وہ چُپ رہی۔ اچھا حسنہ چلتا ہوں۔ رحمت لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہو کر بولا، پھر وہ سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ حسن بانو اپنی مخملی پلنگ پر کروٹیں بدل رہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار رحمت کے ننھے بچے کا چہرہ گھوم رہا تھا اور کانوں میں افشاں کی فریاد گونج رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی اگر افشاں کی جگہ وہ ہوتی تو کیا وہ یہ سب کچھ برداشت کرتی۔ نہیں کبھی نہیں۔ اس کا ضمیر اسے لعنت ملامت کر رہا تھا۔ اسے سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ کوٹھے کی دیواریں اسے کاٹنے کو آرہی تھیں۔ تبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی چھم چھم اسے زہریلے تیر چُبھو رہے تھے۔ سارنگی کے ساز میں اسے افشاں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ حسنہ نے آخری بار گھنگھروں باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دن حسنہ خوب ناچی

یہاں تک کہ اس کے تلوے لہولہان ہو گئے پھر بھی وہ ناچتی رہی۔ رحمت نے بھی انگور کی بیٹی سے خوب آنکھ مچولی کھیلی۔ وہ نشے میں دھت تھا اسی دوران حسنہ نے رحمت کی بچی کھچی پونجی اپنے نام لکھوالی۔ وہ رحمت کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ رحمت پیتا گیا، پیتا گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو فٹ پاتھ پر پایا ہوش سنبھالتے ہی وہ دوڑا دوڑا حسنہ کے کوٹھے پر پہنچا۔ جہاں اسے معلوم ہوا کہ حسنہ تو کل رات ہی یہ کوٹھا چھوڑ کر جانے کہاں چلی گئی۔ رحمت سر پکڑ کر بیٹھ گیا وہ اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا پھر بھی نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

اس کے قدم گھر کی طرف بڑھتے تو وہاں تالا لگا ہوا پایا۔ ایک پڑوسی سے معلوم ہوا کہ اب یہ حویلی نیلام ہو چکی ہے آپ نے مل بھی کسی کو گروی رکھ چھوڑی ہے تب اس کا ماتھا ٹھنکا اسے سمجھ آیا کہ یہ سب حسنہ کی کارستانی ہے۔ طوائف آخر طوائف ہی نکلی، کمینی، بدذات میرا سب کچھ لے کر چلی گئی۔ اس نے سارا غصہ زمین پر تھوکتے ہوئے نکالا۔ اب وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو چکا تھا۔ در در بھٹکتا رہا۔ محلے کے لوگ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے آخر ایک دن یہ سوچ کر کہ افشاں اسے معاف کر دے گیا وہ دوسرے شہر اپنے سسرال چلا گیا۔ جونہی وہ دروازے پر پہنچا تو گھر کے نوکر نے اس کی حالت دیکھ کر اسے بھکاری سمجھ کر نوک جھونک کی اور پھر دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ رحمت سیڑھیوں سے لڑھک گیا شور کی آواز سن کر افشاں باہر نکلی تو دیکھا رحمت کا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا وہ افشاں کے آگے

ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور گڑ گڑانے لگا، مجھے معاف کر دو افشاں مجھے معاف کر دو! میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ مجھے خدا نے سزا دے دی۔ اب تو معاف کر دو۔ میں دولت اور جوانی کے نشے میں بھول گیا تھا کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے.......... اس ذلیل طوائف کے مکاری کے جال میں پھنس کر میں نے تمہیں برا بھلا کہا۔ واقعی وہ ناگن نکلی اس نے مجھے ڈس لیا۔ دھوکے سے میرا سب کچھ اپنے نام لکھوا کر راتوں رات اس شہر سے فرار ہو گئی اور مجھے کنگال کر گئی۔ خدا اسے کبھی معاف نہیں کرے گا کبھی نہیں! وہ دامن سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا، افشاں نے آگے بڑھ کر اسے اوپر اٹھایا۔ بس کیجئے! اس کو مت سیئے! وہ طوائف ضرور تھی لیکن اس کے سینے میں بھی ایک دل تھا اور اس دل میں سارے جہاں کا درد.......... اسے طوائف کس نے بنایا! تم جیسے دولت مندوں نے۔ تمہارے اس بے درد سماج نے.......... وہ ایک عظیم عورت تھی عظیم عورت! یہ تم کہہ رہی ہو افشاں؟ رحمت اس کی جانب حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہاں نواب صاحب یہ حقیقت ہے! وہ تمام جائیداد جو آپ نے اس کے نام لکھ دی تھی۔ وہ تجوری کی چابیاں، وہی تمام دولت جو آپ نے اس پر لٹائی تھی اور وہ ہیرے کی انگوٹھی سب کچھ میرے پاس موجود ہے! ہیں؟؟؟ رحمت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں.......... لیکن وہ تو.......... جانے سے پہلے اس نے یہ سب کچھ خود آ کر مجھے سونپ دیا اور مجھ سے معافی مانگ کر چلی گئی.......... پھر حویلی پر وہ تالا۔ مل گروی رکھنے

کی خبر؟ وہ سب آپ کو صحیح راستے پر لانے کے لئے ڈرامہ تھا۔ تمہارے وہ دونوں دوست حوالات میں بند ہیں............ افشاں واقعی تم ایک صبر و تحمل کا پیکر ہو رحمت افشاں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا، اور اس طوائف کے بارے میں کیا خیال ہے؟ افشاں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا، وہ............؟ وہ تو محسن تھی جو ہوا بن کر اڑ گئی۔

............☆☆☆............

انصاف قُدرت کا

پندرہ برس قبل دولت رام گاؤں میں اپنے حصے کی زمین فروخت کر کے اپنے چند دوستوں کے ہمراہ شہر میں کاروبار کی غرض سے آیا تھا ...... گاؤں میں تو اُسے سارے ''دُلا'' بلاتے تھے لیکن شہر میں آتے ہی اُس کی توند نکل آئی اور وہ سیٹھ دولت رام بن گیا۔ گھر سے باہر تو اس کی بہت عزت تھی لیکن گھر میں اس کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس کی بیوی کافی تیز طرار واقع ہوئی تھی وہ سب کے سامنے اُسے ڈانٹ دیتی، ''تم چپ رہو جی! بڑے آئے اپنی رائے دینے والے۔ چلو اندر جاؤ! وہ بیچارہ شرمسار ہو کر چپ چاپ اندر چلا جاتا...... وہ اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے شانتی کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر شادی کے لئے ہاں کر دی تھی۔ اس نے شانتی کا یہ روپ تو شہر میں آ کر ہی دیکھا تھا ...... '' گاؤں میں تو ساس سسر کے سامنے وہ بھیگی بلّی بن جاتی۔ جیسے اُس

کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ بات کرتی گویا منہ سے شہد ٹپک رہی ہو......
شاید اسی لئے اس کا سُسر دینا ناتھ اس کا قائل تھا تھوڑی آنا کانی کرنے کے بعد اس کی ہر بات مان لیتا۔ جب شہر میں جا کر کاروبار شروع کرنے کا مسئلہ درپیش آیا تو اس نے ہی دینا ناتھ کو شیشے میں اُتار کر اس بات کے لئے رضا مند کیا۔ ورنہ دینا ناتھ شہر میں کاروبار کرنے کے حق میں بالکل نہیں تھا...... ''شہر میں آتے ہی شانتی دیوی کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ...... بنگلہ، گاڑی، رنگین ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، موبائیل دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی پانچ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود صبح کی جوگنگ، بیوٹی پارلر، لیڈیز جم اور کلب جانا اپنا معمول بنا لیا۔ اب وہ پوری طرح شہر کے رنگ میں رنگ چکی تھی۔
تین بیٹیوں کو تو اس نے چھوٹی عمر میں ہی ڈھیر سارا جہیز دے کر بیاہ دیا تھا ......''اب سورج اور جیوتی ہی بچے تھے۔ سورج ڈاکٹری کی تربیت حاصل کر رہا تھا اور جیوتی بارہویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھی .... بیٹے کے لئے شانتی دیوی نے کس کس چوکھٹ پر ماتھا نہیں رگڑا .... خواجہ اجمیری کے دربار میں رو رو کر تو اس کی آنکھوں کی بینائی کمزور ہو گئی اور ڈاکٹر نے اسے نظر کی عینک لگانے کا مشورہ دیا .... تب جا کر شانتی دیوی کے تاریک آنگن میں یہ سورج طلوع ہوا تھا............''

آج پندرہ برسوں کے بعد دولت رام اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ اپنے والدین کے پاس پہنچ گیا تھا۔ تمام پڑوسی اُسے دیکھنے کے لئے آنگن

میں جمع ہو گئے اُن میں اس کا لنگوٹیا یار مہیش چند بھی شامل تھا۔ دولت رام کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے اور وہ دولت رام کے سینے سے لگ گیا...... تو کیسا ہے میرے یار؟ ہم لوگوں کو تو تم نے بھلا ہی دیا! شہر کی زندگی بہت ہی مصروف زندگی ہے میرے دوست! گمنام زندگی میں بڑا سکون ہے! شہرت اور روپے کی لالچ میں نیند بھی اپنی نہیں رہتی! یہ منظر دیکھ کر سب کی پلکیں بھیگ گئیں.......... چل اندر بیٹھ کر باتیں کریں گے! دولت رام اپنی بھیگی پلکوں کو ہاتھ سے پونچھتے ہوئے بولا'' پھر دونوں اندر داخل ہو گئے.......... ''شہر کے زہرِ آلود ماحول سے نکل کر بچے گاؤں میں چاروں اطراف میں ہریالی ہی ہریالی، تازہ ہوا، پر لطف فضا، ٹھنڈے اور شفاف پانی کے ابلتے چشمے، جنگلات کے نظارے، بھولے بھالے چہرے، سادہ زندگی اور جنت نما گاؤں کو دیکھ کر بے حد خوش تھے۔ اس خوبصورت گاؤں نے ان کا دل موہ لیا تھا ان کا بس چلتا تو وہ یہیں رہ جاتے لیکن ''ہائے رے غم روزگار کیا کروں......؟

ایک روز سورج شوقیہ طور گاؤں کی پگڈنڈی پر بائیسکل چلانا سیکھ رہا تھا کہ اچانک بائیسکل بے قابو ہو گئی اور سر پر پانی کا گھڑا لئے چل رہی ایک دوشیزہ سے جا ٹکرائی، دونوں دھڑام سے زمین پر آ گرے'' لڑکی فوراً اپنا آپ سنبھالتے ہوئے سورج سے مخاطب ہوئی'' جاہل، گنوار، اندھے ہو کیا؟ دکھائی نہیں دیتا؟ میرا گھڑا توڑ دیا......! سورج زمین پر پڑے پڑے ہی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔......''۔

کچھ دیر رُک کر وہ پھر برس پڑی ''میرے گھڑے کی قیمت کون دے گا؟ باپو نے پار والے گاؤں سے منگوایا ہے! پورے بیس روپے کا ہے بیس روپے کا! ارے! تم بہرے ہو یا گونگے! اس کا چہرہ غصے سے کشمیری ڈلیشیس سیب کی طرح سرخ ہو چکا تھا وہ اپنا پلو نچوڑتے ہوئے بولی'' تم کوئی سودائی لگتے ہو! جنگلی کہیں کے! غصے میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی اس کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر سورج نے اپنا آپ سنبھالا۔ بے ساختہ اس کے لبوں پر تبسم بکھر گیا۔ ارے گھور گھور کر کیا دیکھتے ہو؟ کیا کبھی لڑکی نہیں دیکھی ہے؟ دفعتاً سورج نے اپنے لبوں کو جنبش دی'' دیکھی ہے میم صاحب! مگر تم جیسی حسین وجمیل، خوبصورت، شوخ، چنچل، الہڑ، بھولی بھالی لڑکی پہلی بار دیکھ رہا ہوں! ایسا جوتا بھی پہلی بار دیکھا ہوگا؟! وہ اپنے پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی'' '' آئی ایم سوری میم صاحب! آپ کا بیس روپے کا نقصان ہو گیا چکا دونگا!'' دراصل میں شہر سے یہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہوں! سوچا بائیسکل چلانا سیکھ لو؟............ ''اچھا تو تم شہر سے آئے ہو؟ اسی لئے اکیلی لڑکی دیکھ کر رال ٹپکنے لگی؟ اے بابو! ہم گاؤں کے لوگ شریف اور بھولے بھالے ضرور ہیں مگر بے وقوف نہیں! میم صاحب آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں!. جی نہیں! میں آپ کو اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ یہاں تمہاری دال گلنے والی نہیں ہے کہہ کر اس نے اپنی لمبی چوٹی کو زور سے جھٹک دیا اور کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی کھیتوں کی طرف چل دی........... '' سورج ہرے ہرے کھیتوں میں دور تک اسے جاتے ہوئے

دیکھتا رہا.........." گھر پہنچ کر جب جیوتی سے اسے معلوم ہوا کہ وہ مہیش چند کی بیٹی ہے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ کرن ہے بچپن میں جسے وہ چوٹیاں کھینچ کھینچ کر چڑایا کرتا تھا...... پتلی، سانولی، ہر وقت چپ چپ، سہمی سہمی، دن بھر ناک بہتی رہتی۔ آج تو اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی ......" کل کی کلی آج گلاب بن کر زندگی کی شاخ پر مہک رہی تھی......وقت کے ابر آلود آسمان سے چاند سا چہرہ جھانک رہا تھا۔ کائنات کی تاریکی نے اس کی زلفوں کو اپنا رنگ دے کر بے پناہ خوبصورتی سے نوازا تھا۔ اس کے معصوم چہرے پر شفق کی لالی جھلکنے لگی تھی۔ غرض یہ کہ اس کا پُر شباب حسن دیکھ کر کوئی بھی اپنا ہوش کھو بیٹھتا......" رات بھر سورج سو نہ سکا بار بار کرن کا غصے بھرا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے کب سحر ہوگئی اسے پتہ ہی نہ چلا......" صبح کو پھر وہ اس پگڈنڈی پر بائیسکل لے کر کرن کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں اسے دور سے کرن اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ آتی دکھائی دی تو سورج کی آنکھوں میں چمک آگئی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا آج وہ عہد کر کے آیا تھا کہ وہ کرن کو بچپن کی ایک ایک بات یاد دلائے گا۔ قریب پہنچتے ہی وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے کے بعد اپنی سہیلیوں سے مخاطب ہوئی "یہی وہ لفنگا ہے جس نے کل اپنی کھٹارا بائیسکل کی ٹکر سے میرا گھڑا توڑ دیا اس کی سہیلیوں میں سے ایک سورج کو غور سے دیکھنے لگی" اسے اپنی طرف اس طرح دیکھ کر سورج گھبرا گیا اور سائیکل چلاتے ہوئے آگے بڑھ

گیا۔ یہ دیکھ کر کرن کی سہیلیوں نے زوردار قہقہہ لگایا...... پھر پہلی والی سہیلی کرن سے کہنے لگی "کرن تم نے اسے پہچانا نہیں؟ نہیں تو! کرن شانے اُچکاتے بولی" ارے یہ تو سرجُو ہے سرجُو! کیا؟؟ یہ سن کر کرن کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ سورج ہی سرجُو ہے! پندرہ سال کے بعد شہر سے اپنے دادا کے پاس آیا ہے۔ اب تو یہ شہر کے ہی ہو کے رہ گئے ہیں...... یہ سن کر کرن کو سورج کے ساتھ کئے ہوئے برتاؤ پر شرمندگی کا احساس ہوا......" دو مہینے کی چھٹیوں کے دوران دونوں نے بچپن کی تمام یادیں تازہ کیں...... کئی عہد و پیماں ہوئے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئیں اور پھر بات جنم جنم کے بندھن تک پہنچ گئی۔ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہر لوٹنے سے قبل سورج نے اپنے ماں باپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ دولت رام کو بھلا اس شادی پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کرن ان کے لنگوٹیا یار کی بیٹی تھی۔ البتہ اس رشتے سے شانتی دیوی کے سارے خواب چکنا چور ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اس کی نظر تو شہر میں ایک امیر سہیلی کی طلاق شدہ بیٹی پر تھی۔ جس کی دوسری شادی پر اس نے جہیز میں ایک فیکٹری اور ایک بی ایڈ کالج دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا یہی خواب تھا کہ سورج ڈاکٹر بن کر ڈھیر سارا روپیہ کمائے لیکن سورج کو دل کی دولت کے آگے دنیا کی دولت ہیچ لگ رہی تھی۔ شانتی کے انکار کرنے پر سورج نے خودکشی کی دھمکی دے ڈالی...... مرتی کیا نہ کرتی.......... سسر دینا ناتھ کے کہنے پر مجبور ہو کر شانتی کو مہیش کے گھر کرن کا ہاتھ مانگنے جانا پڑا......" سو آج مہیش چند کی دختر نیک

کرن دولت رام کے بنگلے میں قدم رنجہ فرما چکی تھی۔ دن پنکھ لگا کر کسی مست پرندے کی مانند محو پرواز تھے۔ وقت نے کروٹ بدلی بہار خزاں، دیوالی، دسہرہ آتے جاتے رہے۔ اس طرح سورج اور کرن کی شادی کو پورے دو برس ہو گئے۔ ان دو برسوں میں بہت کچھ بدل گیا۔ سورج کی تعیناتی شہر کے بڑے اسپتال میں ہو گئی۔ دولت رام حرکت قلب بند ہو جانے سے دنیا سے چل بسا۔ کرن نے جیوتی کے ساتھ بی اے میں داخلہ لے لیا۔ سارے کاروبار پر شانتی دیوی کا مکمل اختیار ہو گیا۔ اس کے حکم کے بغیر گھر میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ نوکر اس کی گرجدار آواز سن کر کانپ جاتے تھے اتنی دولت ہونے کے باوجود اس کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی...... نہیں کچھ بدلا تھا تو وہ کرن کے تئیں شانتی دیوی کی نفرت۔ جو جہیز نہ لانے کے سبب تھی ......دولت رام کے جیتے جی شانتی چپ رہی لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے تیور بدل گئے......'' بات بات پر طعنے......جھڑکیاں...... سنتے سنتے کرن کے تو کان پک گئے لیکن وہ سورج کو اس لئے کچھ نہ بتاتی کیونکہ اس سے مسئلہ طول پکڑ سکتا تھا اور ساری بات بیچاری کرن پر آ جاتی......وہ اچھے سنسکار لے کر آئی تھی صبر اور تہذیب کا سبق اسے بچپن سے ہی پڑھایا گیا تھا اسے اپنے بھگوان پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ پوجا پاٹھ پر زیادہ دھیان دیتی تھی۔ البتہ جیوتی کو اپنی بھائی سے بہت ہمدردی تھی وہ بھی جیوتی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھتی تھی۔ جب بھی وہ اپنے لئے کپڑے خریدنے نکلتی تو جیوتی کیلئے بھی ایک دو سوٹ لے آتی......'' کرن کی یہی

خوبیاں جیوتی کو محبت کرنے پر مجبور کر دیتی تھیں......لیکن شانتی کی آنکھوں میں کرن کیکر کے کانٹے کی مانند کھٹک رہی تھی جس کی وجہ سے شانتی کو کروڑوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ وہ فیکٹری اور بی ایڈ کالج آج بھی خوابوں میں آ آ کر ستاتے تھے لیکن اس نے بھی دل میں ٹھان لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ سب کچھ حاصل کر کے ہی رہے گی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس نے اپنی بیٹیوں کو لاکھوں کا جہیز دے کر وداع کیا تو بیٹے کی شادی پر وصول کرنے میں کیا حرج ہے؟ وہ دن شانتی کے لئے بڑی خوشی کا دن تھا جب سورج کو پی جی کے لئے ریاست سے باہر جانا پڑا۔ شانتی دیوی کی باچھیں کھل گئیں......" رات کو سارا عالم محوِ خواب تھا تو کرن پلنگ پر کروٹیں بدل رہی تھی سورج نے اسے دلاسہ دیتے کہا" اری پگلی! تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ میرا رتبہ بڑھ رہا ہے! اگر تم یونہی آنسو بہاتی رہی تو مجبوراً مجھے یہ چانس ڈراپ کرنا پڑے گا۔ نہیں نہیں! وہ تڑپ اُٹھی" آپ ضرور جائیے۔ میں اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گی لیکن وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے روزانہ ٹیلی فون کیا کریں گے! کرن نے سورج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا" دیکھو کرن وہاں پڑھائی پر زیادہ دھیان دینا پڑے گا۔ اس لئے روز فون کرنا ممکن نہیں۔ ہاں ہفتے میں دو ایک فون ضرور کیا کروں گا۔ چلو اب مسکرا دو! پھر کرن ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سورج سے لپٹ گئی......"

سورج کو گئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران اس نے جب بھی فون کیا تو ماں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی وہ کالج سے نہیں

لوٹیں، یا وہ نوٹس تیار کرنے پروفیسر کے پاس گئی ہیں۔ کرن جب بھی فون کے متعلق پوچھتی تو اس کا جواب ہوتا" سورج کے پاس فرصت ہی کہاں ہے اسے ڈسٹرب مت کرو۔ اسے پڑھنے دو! اسے زندگی میں کچھ بننا ہے۔ اس کی مت ماری گئی تھی جو اس نے تجھ سے شادی کر لی" چل اندر رسوئی میں کافی کام باقی ہے! وہ بے چاری دل مسوس کر رہ جاتی...... " دن گزرنے کے ساتھ ساتھ شانتی دیوی کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی ۔ ہر وقت کرن کو کلموہی، کلنکنی، کنگال کی بیٹی جیسے الفاظ سے نوازتی رہتی لیکن وہ اُف تک نہ کرتی۔ کیونکہ اس کے پنکھ تو سورج کے جاتے ہی کٹ چکے تھے۔ وہ کسی بے بس پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ جاتی...... اس کے بیمار پڑ جانے پر کالج کے کچھ لوگ اس کی مزاج پرسی کے لئے گھر کیا آگئے شانتی دیوی نے گھر میں قیامت برپا کر دی اور یہ کہہ کر اس کا کالج جانا بند کر دیا کہ وہ کالج میں آوارہ لڑکوں کے ساتھ گل چھڑے اُڑاتی ہے۔ جیوتی نے ماں کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سب جھوٹ ہے، بھیا سنیں گے تو غضب ہو جائے گا" تو جا کے اپنا کام کر! سورج کو میں خود سنبھال لوں گی" شانتی گرجدار آواز میں بولی" بیچاری جیوتی اپنا سا منہ لے کر چلی گئی" ایک روز کرن رسوئی میں برتن صاف کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کرن نے آگے بڑھ کے ریسور اٹھا لیا سورج کی آواز کانوں سے ٹکراتے ہی کرن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہنے لگی اس کی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔ ابھی خیر خیریت ہی پوچھی تھی کہ شانتی دیوی نے کرن کے ہاتھ سے یہ کہہ کر ریسور چھین لیا کہ رسوئی میں کچھ جل رہا ہے خود سورج کو ڈھیر ساری نصیحتیں

کرنے کے بعد شانتی نے ریسور رکھ دیا اور اس طرح اُس نے کرن کے جذبات کو کچل کر رکھ دیا......" سورج بیچاری کو کیا معلوم کہ کرن کے آنسو جدائی کی داستان بیان کر رہے تھے یا ظلم و ستم کی روداد؟ وہ تو اپنی ماں کو دیوی کا درجہ دیتا تھا اسے کیا معلوم کہ اس کی ماں لومڑی کی طرح چالاک اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی عورت، بے حد لالچی اور ہٹلر کی طرح ظالم ہے۔ کرن پر بیہودہ الزام لگا کر بدنام کرنے کے پیچھے شانتی کا ایک ہی مقصد تھا کہ یہ سب باتیں سننے کے بعد سورج آپے سے باہر ہو جائے گا اور کرن کو طلاق دے دے گا اور اس کی دوسری شادی کا راستہ صاف ہو جائے گا......"ایک روز شانتی نے کرن کو یہ کہہ کر میکے بھیج دیا کہ سورج کو جلدی سے جلدی ۶۰ ہزار روپیوں کی سخت ضرورت ہے تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ آج کل کاروبار بھی گھاٹے میں چل رہا ہے اس لئے تم اپنے باپ سے جا کر ۶۰ ہزار روپے لے آؤ، مجھے امید ہے کہ وہ اپنے داماد کی ترقی کے لئے ضرور کچھ کریں گے۔ کرن کی روداد سن کر بوڑھے باپ کا دل پسیج گیا اس نے کرن کی خوشی کے لئے گاؤں کے زمیندار کے پاس برلب سڑک والی زمین گروی رکھ کر ساٹھ ہزار روپے لائے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ زمین چھڑانا اس کے لئے کس قدر مشکل ہے......"اس طرح کرن نے شانتی سے سکھ کے کچھ دن اور خرید لئے لیکن پھر تو معمول بن گیا۔ کبھی پندرہ ہزار، کبھی دس ہزار لاتی رہی......" وہ جہیز نہ لانے کی سزا بھگت رہی تھی اور شانتی دیوی جہیز کی قیمت قسطوں میں وصول کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ جو زمین مہیش نے کرن کے لئے رکھی ہوئی تھی۔ شانتی دیوی نے رفتہ رفتہ اُسے بھی بیچنے پر مجبور کر دیا جب کرن

نے مزید رقم لانے سے انکار کر دیا تو شانتی دیوی کے ظلم وستم اور بھی بڑھ گئے۔
اس نے گھر کے نوکروں کی چھٹی کر دی سوائے ایک نوکر کے جو کئی معاملوں میں
اس کا راز دار تھا۔ گھر کا سارا کام کرن پر ڈال دیا۔ بات بات پر اسے ذہنی
اذیتیں پہنچاتی۔ ایک روز تو شانتی نے ظلم کی حد کر دی۔ کرن کا بستر اٹھا کر مالی کی
کوٹھری میں پھینکتے ہوئے بولی ''بڑی آئی ڈنلپ پر سونے والی۔ ایک چٹائی ہی
باپ کے گھر سے لائی ہوتی......'' کرن کو شانتی دیوی کی باتیں نشتر کی طرح چبھ
رہی تھیں۔ لیکن اسے باپ نے صبر کی تلقین کی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ بھگوان کی
مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا وہ جو کرے گا بہتر کرے گا......'' رات دیر کو کام
سے فارغ ہو کر کرن کو سونے کے لئے مالی کی کوٹھری میں جانا پڑتا'' اس دوران
سورج کے کئی فون آئے لیکن شانتی دیوی نے سورج کو بڑے محبت بھرے
انداز میں یہ جواب دے کر چپ کرا دیا کہ کرن کے باپ کی طعبیت ٹھیک نہیں
تھی میں نے کہا جا کر دیکھ آ۔ یہ سن کر سورج کو خوشی ہوئی کہ اس کی ماں کرن کا کتنا
خیال رکھتی ہے۔ کرن کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر شانتی دیوی کو دلی سکون
نصیب ہوتا تھا۔ اسے مالی کی کوٹھری میں سلا کر خود ایک وفادار نوکر کو لیکر شاندار
بنگلے میں آرام فرماتی۔ کرن نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سورج کے
آنے پر وہ اسے سب کچھ صاف صاف بتا دے گی چاہیے جو بھی ہو جائے......''
تمام حربے استعمال کرنے کے باوجود جب کرن گھر چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی تو
شانتی آگ بگولا ہو اٹھی اسے فیکٹری اور بی ایڈ کالج ہاتھ سے نکلتے ہوئے دکھائی
دینے لگے۔ تب اس نے یہ ساری کہانی اپنی ایک سہیلی کو سنائی جو اس معاملے

میں بہت شاطر اور تجربہ کار تھی اور چند سال قبل اس نے بھی اپنی بہو کو اپنے راستے سے ہٹا کر اپنے بیٹے کی اچھی خاصی قیمت وصول کر چکی تھی۔ شانتی دیوی بھی اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ پھر دونوں نے مل کر دو تین منصوبے بنائے اور یہ طے پایا کہ ان میں سے جو بھی کارگر ثابت ہو آزمایا جائے۔ ویسے تو شانتی دیوی کرن کو اس سے پہلے بھی غسل خانے کے شاور کے ساتھ بجلی کا کنکشن جوڑ کر مارنے کی کوشش کر چکی تھی لیکن بے سود......"

جیوتی کو کرن پر ترس آرہا تھا وہ ماں کو سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھی کہ ایک بے بس پر اس قدر ظلم کرنا ٹھیک نہیں! لیکن شانتی کے لہجے میں تلخی دیکھ کر وہ اپنے لب سی لیتی ...... پچھلے کئی دنوں سے کرن کی طبیعت ناساز تھی ڈاکٹر نے دوا کھانے کے ساتھ ساتھ آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن اُس کی قسمت میں آرام کہاں تھا۔ کرن صبح سویرے اُٹھ کر گھر کی صفائی سے لیکر رسوئی وغیرہ کے کام میں لگ جاتی۔ کبھی کبھار اس کام میں جیوتی اس کی مدد کر دیتی تھی لیکن کچھ دنوں سے وہ اپنی ایک سہیلی کی شادی میں بے حد مصروف تھی۔ گھر آتی بھی تو فقط کپڑے وغیرہ بدلنے کے لئے۔ کئی بار رات دیر سے آتی تو مجبوراً بیچاری کرن کو ہی گیٹ کھولنا پڑتا......" رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ چاند کو ابر کے ایک ٹکڑے نے اپنی تحویل میں لے رکھا تھا۔ بیچارے ستارے اس کی جدائی میں ٹمٹما رہے تھے۔ دور کہیں سے چوکیدار کی گرجدار آواز سنائی دے رہی تھی" جاگتے رہو......! جاگتے رہو......!

شانتی نے سوچا اسے کیسے معلوم کہ اس کے مشورے پر کوئی عمل پیرا

ہے وہ لابی میں جانے کب سے ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ فیکٹری اور بی ایڈ کالج رہ رہ کر رقص کر رہے تھے جہاں وہ اپنی سہیلی کے ساتھ کئی بار جا چکی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے دفعتاً وہ رُک گئی اس نے اپنے دماغ میں ایک خطرناک شیطانی منصوبہ ترتیب دیا اور پھر اس پر عمل کرنے کے لئے موقعہ کی تلاش کرنے لگی۔ لالچ نے اس کی بینائی چھین لی تھی پھر وہ بتی بجھا کر اطمینان سے اپنے بستر پر لیٹنے کی کوشش کرنے لگی...... "آج صبح سے ہی کرن بہت تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی اسی لئے وہ جلدی جلدی سارا کام نپٹا کر مالی کی کوٹھری میں سونے کے لئے چلی گئی۔ بنگلے کی تمام بتیاں گل تھیں۔ شہر کے جیل میں لگے گھنٹے نے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو چند لمحوں بعد گیٹ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ گہری نیند میں ہونے کے سبب جب نوکر نے گیٹ نہ کھولا تو نہ چاہتے ہوئے بھی کرن نے مجبوراً گیٹ کھولا" کرن کی حالت دیکھ کر جیوتی کو اس پر رحم آ گیا۔ وہ اپنی ماں کو کوسنے لگی، اس نے کرن کے ماتھے کو چھوا تو چونک گئی۔ ارے؟؟ آپ کو تو بہت تیز بخار ہے چلو چلو اندر چلو! جیوتی اسے تھامتے ہوئے اندر لے گئی...... میں نے دوا لے لی تو جا کر سو جا......! کرن اپنا درد چھپاتے ہوئے بولی" بھابی میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آخر کار کرن کو جیوتی کے آگے ہار ماننی پڑی......"۔

دسمبر کا سرد مہینہ تھا...... چاروں طرف اندھیرے کا راج، آسمان کو کالے بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ بے لباس شجر ہوا سے تھر تھرا رہے تھے...... دور کسی مندر کے لاؤڈ سپیکر سے بھجن کی آواز آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی دھند چھائی

ہوئی تھی۔شانتی دیوی نے کروٹ بدلی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔شاید اس کے سر میں بہت درد تھا۔اس کی نظر سامنے کے کلاک پر پڑی تو اس کی بھنویں تن گئیں'' ہیں؟؟ صبح کے پانچ بج چکے تھے اور ابھی تک اسے کرن نے بیڈ ٹی نہیں دی۔اس کے کانوں میں آج بھگوت گیتا کے پاٹھ کی آواز بھی نہیں آئی جو کرن کا روز کا معمول تھا۔اس کا مطلب ہے کرن ابھی تک نہیں جاگی؟ شانتی کو اس وقت چائے کی طلب ستا رہی تھی۔وہ اُٹھ کر جیوتی کے کمرے کی طرف گئی۔وہاں کمرہ خالی دیکھ کر وہ بڑبڑاتے ہوئے کوٹھری کے قریب پہنچ کر زور زور سے کرن کرن چلانے لگی۔اندر سے کوئی جواب نہ پا کر وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی۔اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج سے کرن کا کھانا پینا بند......! وہ دانت پیستے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی۔اس نے سوچا نوکر کو کیا جگائے۔ وہ خود ہی چائے بنانے کے لئے رسوئی میں داخل ہوگئی۔آج ایک مدت کے بعد وہ رسوئی کے اندر گئی تھی۔پتیلی میں پانی، چائے اور کھانڈ ڈال کر اس نے گیس چولہے پر چڑھائی۔ریگولیٹر کا سوئچ آن کرتے ہی اس کی چھٹی حس پھڑک اٹھی۔اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔پھر وہ کچھ سوچ کر ٹھہر گئی۔وہ اسی موقعے کی تلاش میں تھی۔اس نے سوچا کیوں نہ آج وہ اپنا کام کر ہی ڈالے۔جیوتی کی عدم موجودگی میں اسے اپنا کام اور بھی آسان لگا......'' اگلے ہی لمحے شانتی دیوی اپنے وفادار نوکر کے ساتھ گیس سلینڈر لے کر کرن کو جلا کر مار ڈالنے کی غرض سے کوٹھری کے قریب کھڑی تھی نوکر

نے سلینڈر کے ساتھ لگی پائپ کھڑکی کے سوراخ سے اندر ڈال دی اور جھٹ سے ریگولیٹر کا سوئچ آن کر دیا اور شانتی نے چور نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کوٹھری کو دیا سلائی دکھا دی، چند ہی سکینڈ میں کوٹھری کے اندر سے آگ کی لپٹیں نکل کر آسمان کو چھونے لگیں اور بچاؤ بچاؤ! کی چیخیں سنائی دینے لگیں...... آگ دیکھ کر محلے کے تمام لوگ جمع ہو گئے ...... لوگوں کو دیکھ کر شانتی بھی جھوٹے آنسو بہاتے ہوئے بولی' ہائے میری کرن! میں سورج کو کیا جواب دوں گی؟ کرن کے بدلے میں مر گئی ہوتی ......" کچھ عورتیں اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہہ رہی تھیں......" صبر کرو بہن! بھگوان کی مرضی کے آگے کس کی چلی ہے۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا بھگوان؟ وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگی" دفعتاً اس کی نظر گیٹ کی طرف گئی تو اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں......زبان گھنگ ہو گئی......تمام جسم پسینے سے تر ہو گیا......سامنے ہاتھ میں پوجا کی تھالی لئے جیتی جاگتی کرن کھڑی تھی ......" شانتی کپکپاتے لبوں سے بمشکل اتنا پوچھ سکی" اری کمبخت تو کہاں تھی؟ ماں جی میں تو مندر گئی ہوئی تھی" "تو پھر اندر کون تھا؟ ہاں......؟ یہ سنتے ہی کرن کے ہاتھوں سے تھالی گر گئی......" وہ بے تحاشہ کوٹھری کی طرف بھاگتے ہوئے چلائی" جیوتی کو بچاؤ......! جیوتی کو بچاؤ......!

جیوتی کا خیال آتے ہی شانتی دیوی کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔

............☆☆☆............

اُلٹی گنگا

نریش کمار محکمہ مال میں بطور کلرک بھرتی ہوا تھا۔اس کی شرافت، محبت اور ایمانداری کے ہر سو چرچے تھے وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس نے پاؤں پھنسانے کے لئے کلرک کا عہدہ قبول کیا تھا۔کیوں کہ وہ غربت کے اس دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ جہاں سے سرمایہ دار طبقہ غربا کو کبھی باہر نکلنے نہیں دیتا .... وہ غریب ضرور تھے مگر محنتی .... اس کا باپ دینا ناتھ محکمہ تعلیم میں ایک قابل استاد تھا۔ وہ ہمیشہ وقت پر اسکول جاتا اور بڑی محنت، لگن اور ایمانداری کے ساتھ بچوں کو پڑھاتا۔جب کہ اس کے ساتھ والے استاد و استانیاں اسکول میں کیرم کھیل کر یا پھر سویٹر بُن کر وقت گزارتے اسے یہ سب بہت عجیب لگتا ....

جب بھی کوئی استاد بچوں کو اپنے گھر پر کام کرانے کیلئے بھیج دیتا تو وہ سوچتا، والدین تو گھر سے بچوں کو اسکول میں تعلیم حاصل کرنے بھیجتے

ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ تو دن بھر استاد کے مویشیوں کے لئے گھاس ڈھو رہے تھے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، بچے تو اسکول سے فرار ہونے کا بہانہ تلاش کرتے ہیں۔ امتحان میں بچے بھی بغیر پڑھے لکھے پاس اور پھر اساتذہ کی سالانہ انکریمنٹ بھی بنا پڑھائے ریلیز............ دینا ناتھ کو نوکری کی قدر اس لئے تھی کیونکہ اس نے اپنی ساری نوکری کا زیادہ عرصہ دور دراز کے دیہاتوں میں گزارہ تھا۔ اب تو وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھا اس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر نریش کو پڑھایا تھا............ نریش کو بھی اپنے باپ کی محنت کا احساس تھا۔ اسی لئے وہ صبح سویرے ہی قبرستان میں یا کسی سنسان جگہ پڑھنے کیلئے چلا جاتا۔ اسے اپنے باپ کی ایمانداری پر فخر تھا۔ دینا ناتھ ہمیشہ اسے محنت اور ایمانداری کی نصیحتیں کرتا۔ نریش کی ماں شانتی دیوی سچ مچ دیوی تھی۔ محلے میں سب اس کا احترام کرتے تھے۔ مہنگائی کے اس دور میں شانتی دیوی کھینچ تان کر برابری لاتی۔ وہ بیچاری ایک ساڑھی دھوتی تو دوسری پہنتی۔ دو لڑکیوں کی پڑھائی کا خرچہ............ باقی جینا مرنا تو لگا ہی رہتا ہے۔ سمجھو کہ مشکل سے روٹی کپڑا اچل نکلتا تھا۔ دینا ناتھ پیر فقیروں کو بھی بہت مانتا تھا۔ شاید ان کی دعائیں بھی نریش کی ملازمت میں شامل تھیں۔ نریش کے دوستوں کا خیال تھا کہ باپ کو اس قدر کمانا چاہیئے کہ اولاد کو نوکری کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ نریش سمیت تمام دوستوں کو بھگوان سے بدگمانی سی ہوگئی تھی۔ جس نے زندگی کی شکل میں انہیں اس سنسار میں سزا بھگتنے کے لئے بھیج دیا۔ بھگوان کو اس غلطی کی

سزا دینے کے لئے تمام دوست اپنے آپ کو ناستک کہتے تھے.........

محکمہ میں رہ کر نریش نے محنت کی اور کے، اے، ایس کا امتحان پاس کر کے آج وہ تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا اب وہ بے روزگار نہیں تھا بلکہ گورنمنٹ کا ملازم تھا۔ ملازم ہی نہیں بڑا افسر تھا.......... خدا کے فضل سے محکمہ مال میں مال ہی مال ہے۔ ضلع میں ایسی کوئی جگہ نہیں جو اس محکمہ کے دائرہ اختیار میں نہ ہو۔ جب تک وہ کلرک تھا باپ کے سارے اصول اس نے گانٹھ باندھ کر رکھ لئے تھے وہ اپنے باپ کو دور دراز کے دیہاتوں میں نوکری کرتے دیکھ کر اکثر سوچتا، کہ پندرہ سال قبل جب وہ شہر کے ہائر سکنڈری اسکول میں نویں جماعت کا طالب علم تھا تو اس اسکول میں ایک استاد جس کا نام تھوڑو رام تھا۔ اکثر بچے اسے مذاق سے ہتھوڑا رام کہتے تھے۔ کھڑوس، مہا کنجوس، ایک سوٹ دھوتا اور دوسرا پہنتا.........
ٹھنگنا قد، بھرا جسم، بڑا چہرہ، نیولے جیسی چھوٹی آنکھیں، شلغم جیسی موٹی ناک، سر پر چند سفید بال، آگے والے دو دانت ٹوٹے ہوئے۔ چال ڈھال بالکل سانڈ جیسی۔ اس کا سراپا نریش کی آنکھوں میں بے ساختہ ہی گھوم جاتا۔ اسکول کے سبھی بچے اس کے پاس انگریزی مضمون پڑھنے کے لئے ٹیوشن پڑھتے۔ جو بچہ ٹیوشن نہیں پڑھ سکتا اسے ہر حال میں کم نمبرات ملتے۔ یوں سمجھ لو وہ صاحب ٹیوشن کے پردے میں تعلیم کا بیوپار کر رہے تھے۔ اپنے کرتوتوں کی بدولت وہ بہت بدنام تھا لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اس عمر میں بھی وہ رنگ برنگی تتلیاں پکڑنے کا شوقین تھا اور آج

پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی وہ اسی اسکول میں تعینات تھا۔ نریش سوچتا اس کے لئے کوئی حکومت نہیں؟ کوئی قانون نہیں ہے؟ کوئی تبادلہ نہیں ہے؟ جو وہ پچھلے پندرہ برس سے مسلسل ایک ہی اسکول میں قبضہ جمائے ہوئے بیٹھا دیہات کے غریب بچوں کا خون چوس رہا ہے اور ایک اس کا باپ ہے جسے ہر دو سال کے بعد یہاں سے وہاں ہجرت کرنی پڑتی ہے۔ شاید سارے قانون بیچارے غریبوں کے لئے ہیں، امیر تو روپے خرچ کر کے یا پھر اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اپنے تبادلے رکوا دیتے ہیں۔ غریب روپے کہاں سے لائے؟ رسوخ تو بعد کی بات ہے! ووٹ لینے کے بعد تو سیاسی لوگ بھی ان سے آنکھ نہیں ملاتے.......... دینا ناتھ زندگی کے ان تلخ تجربات سے گذر چکا تھا اسے حکومت سے سخت ناراضگی تھی.......... لیکن افسر بنتے ہی نریش کی سوچ میں تبدیلی آ گئی.......... نصیحتوں کی گٹھری کی گانٹھیں کھلتی گئیں اور وہ اپنے باپ کے سارے اصول بھول گیا..........

ساری قربانیاں بھول گیا۔ کلرکی میں جب وہ تحصیلدار کے ساتھ ضلع کے دورے پر جاتا تو اسے لوگوں سے روپے، راجماش، دیسی گھی، اخروٹ اور شہد وغیرہ کے تحفے لیتے دیکھ کر سوچتا، کتنا ظالم افسر ہے کپڑے تک نہیں چھوڑتا.......... لیکن اب تو نریش نے بائیں ہاتھ کی کمائی کے سارے گُر اچھی طرح سیکھ لئے تھے۔ اس نے ایسی جگہوں پر زمین خریدنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں سے کچھ ہی سالوں کے بعد سڑک اسی زمین میں سے گزرتی۔ یوں سمجھ لو کہ صاف ستھری کمائی.......... کلرکی میں ہی گھر

والوں نے نریش کے پیروں میں شادی کی اٹوٹ بیڑیاں ڈال دیں تھیں تاکہ وہ ادھر ادھر نہ بھٹک سکے۔کلرکی میں وہ اکثر بیوی کی سادگی کا اپدیش دیتے ہوئے کہتا۔ دیکھو رکمنی! گاندھی جی دنیا کے سب سے بڑے انسان مانے جاتے ہیں مگر کھدر کے سوا دوسرے کپڑے کو چھوتے تک نہیں تھے اور تم ہو کہ جب دیکھو ریشم اور مخمل کی فرمائش کرتی رہتی ہو! ....رکمنی بیچاری جل بھن کر کہتی ٹھیک ہے ایک نہ ایک دن تمہیں میری فرمائشیں پوری کرنی ہی پڑیں گی! پھر آج نہیں تو کل تمہاری ترقی ہو ہی جائے گی، پڑھائی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ پھر تو وارے نیارے ہونگے ....شاید رکمنی کی بھگوان نے سن لی تھی۔ اب نہ صرف نریش آستک بن چکا تھا بلکہ صبح وشام گیتا کے انگریزی ترجمے کا پاٹھ بلا ناغہ کرتا تھا اور فارن کے کپڑے پہننے بھی شروع کر دیئے تھے۔ جب بھی وہ ضلع کے دورے پر جاتا تو واپسی پر سعودی عربیہ کے کپڑے اٹیچی کیس بھر کر لاتا اور رکمنی سے کہتا پورے بیس ہزار کے ہیں اگر کسٹم دینا پڑتا تو تیس ہزار کے ہو جاتے۔ یہ تو بھلا ہوا اس حاجی کا، جو پہلے ہی کسٹم والوں کو چائے پانی دے چکا تھا..........رکمنی ازراہ مذاق کہتی، جب میں بدیشی کپڑے مانگتی تھی تو تم بازار سے کھدر اٹھا کر لاتے تھے۔ جوانی تو گاندھی جی کے چیتھڑوں میں ڈھل گئی اب سادگی کی عمر ہے کھدر کہتی ہوں تو مخمل اٹھا لاتے ہو..........نریش مسکراتے ہوئے کہتا، اری پگلی انسان کو وقت کے ساتھ بدلنا چاہئے..........دیکھو رکمنی! گاندھی جی کھدر کے پہننے سے خوش ہوتے ہیں اور بھگوان بدیشی کپڑوں

سے کہ میرے بھگت نے بدیشی کپڑے پہنے ہیں کبھی تم نے مندر میں بھی کھدر دیکھا ہے؟ تم کسے خوش کرنا چاہتی ہو۔

گاندھی جی کو یا بھگوان کو؟ پھر جوانی تو تم پر اب شروع ہوئی ہے۔ امیروں کی جوانی روپیوں سے ہوتی ہے اور غریبوں کی روٹی سے! وہ خیالات کے سمندر میں غوطہ زن ہی تھا کہ نریش کی گرجدار آواز سے اس کی سوچ کا شیرازہ بکھر گیا.......... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے! کہو اپنی صفائی میں تمہیں کچھ کہنا ہے؟ نریش کی آواز سارے کمرے میں گونج گئی .... "چندو کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا، مائی باپ میں نے رشوت نہیں لی تھی۔ اس شخص کے حق میں آپ نے فیصلہ سنایا تھا اس لئے خوش ہو کر اس نے مجھے پچاس روپے دیئے تھے بعد میں اس نے آپ سے جھوٹی شکایت کر دی.......... اس شخص کا کہنا ہے کہ تم نے اس سے اندر چھوڑنے کے پچاس روپے طلب کئے تھے۔ نہیں نہیں، حضور، یہ جھوٹ ہے، تم نے پچاس روپے لئے کہ نہیں۔ ہاں مائی باپ لئے پر.......... گویا تم اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو! نہیں جناب وہ تو.......... چپ کرو! رشت ہر حال میں رشوت ہے خواہ وہ لی جائے یا دی جائے، میں اس محکمہ میں ایک عبرت ناک مثال قائم کرنا چاہتا ہوں تا کہ آئندہ اس دفتر میں کوئی بھی ملازم رشوت لینے کی جرأت نہ کر سکے..........!

اس جرم کی پاداش میں تمہیں کلکرک صاحب کے حکم سے برطرف کیا

جاتا ہے.......... نہیں نہیں حضور! میں رحم کی بھیک مانگتا ہوں میرے بچے بھوکے مرجائیں گے، چندو گڑگڑانے لگا .... "خاموش! اگر بال بچے کا اتنا ہی خیال تھا تو رشوت لی ہی کیوں تھی .... رشوت خوروں پر میں رحم کرنا بالکل نہیں جانتا ....، اتنا کہہ کر نریش نے چندو کو دفتر سے باہر نکل جانے کا حکم دیا .... چندو بیچارہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔ نریش نے ٹائپسٹ کو بلایا اور ایک ورق پر کچھ لکھ کر اسے تھما دیا ٹائپسٹ نے ورق کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اور دروازے سے باہر نکل آیا .... تحصیلدار نریش کمار کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا اس نے قلمدان میں قلم رکھا اور باہر نکلنے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک شخص دفتر میں داخل ہوا.......... تحصیلدار صاحب اسے دیکھ کر ٹھہر گئے.......... آیئے کیسے آنا ہوا؟.......... نریش نے اپنے ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے پوچھا، سرکار وہ زمین کا انتقال کرانا مطلوب تھا، آپ کے کلرک اور پٹواری سے بات ہو گئی ہے کلرک نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مسئلہ بہت اہم ہے امید لے کر آیا ہوں، سنا ہے جناب رشوت کے سخت خلاف ہیں اور آج ہی ایک رشوت خور ملازم کو سزا دی ہے۔ جناب اگر آپ جیسے افسر ہر محکمہ میں ہوں تو رشوت کا نام تک مٹ جائے۔ اپنی ایمانداری کی تعریف سن کر نریش کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی.......... اتنے میں اس شخص نے نریش کمار کی جانب ایک سفید رنگ کا لفافہ بڑھایا.......... نریش نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا، اے مسٹر میں

شفارش نہیں سنتا۔ اس میں سفارش نہیں ہے جناب ! نذر و نیاز سمجھ لیجئے۔ برگ سبز تحفہ درویش، قبول فرمائیں...........نریش نے لفافہ پکڑ کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور شخص سے کہا ٹھیک ہے تمہارا کام ہو جائے گا اور خود اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا...........گھر پہنچ کر نریش نے جیب سے لفافہ نکال کر کھولا اندر سے سوسو کے ۵۰ (پچاس) نوٹ مسکرا رہے تھے وہ گننے ہی والا تھا کہ رکمنی نوٹوں پر چیل کی مانند جھپٹ پڑی اور بولی "اس میں سے ایک کوڑی بھی بنک میں نہیں جائے گی"

گھر کے لئے جدید طرز کا فرنیچر لانا ہے، دیکھو نا یہ صوفہ، دو سال پرانا ہے اب آوٹ آف فیشن ہو گیا ہے۔ نریش نے قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے کہا، اری بھاگے وان روپے دیکھتے ہی کھانا دینا بھی بھول گئی، ہیں؟ اف او...........پھر دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

...........☆☆☆...........

چوڑیاں

دیوار پر لگے کلاک نے بارہ گھنٹیاں بجائیں تو نسرین ایک جھٹکے سے جاگ گئی اس کی نظر راحیل کے کمرے میں جل رہی بتی پر پڑی تو وہ سیدھا اس کے کمرے میں چلی گئی......راحیل پڑھتے پڑھتے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔ ماں نے اس سے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ کتاب لینے کی کوشش کی تو وہ ہڑبڑا کر جاگ گیا، کون ہے؟ کون ہے؟............ارے بیٹا میں ہوں! امّی جان! آپ ابھی تک سوئی نہیں؟ ارے یہ کیا؟ تم نے ابھی تک دودھ نہیں پیا؟ نسرین نے راحیل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ امّی آپ خواہ مخواہی میری فکر کرتی ہیں۔ میں کوئی چھوٹا بچہّ تو نہیں ہوں.......... ہاں ہاں تو تو بڑا بزرگ ہو گیا ہے چل یہ دودھ پی لے!! راحیل نے مسکراتے ہوئے دودھ کا گلاس اٹھا کر حلق میں اتار دیا۔ امّی جان آپ کتنی اچھی ہیں! راحیل نے اپنے ہونٹوں کو پونچھتے ہوئے کہا، مکھن لگانا چھوڑ......رات

بہت ہوگئی چل سو جا۔ صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔ بتی یاد سے بند کر لینا۔ کہہ کر نسرین کمرے سے نکل گئی......نسرین ایک نیک سیرت اور محنتی عورت تھی۔ ایک دن اس کا خاوند راحیل کے لئے شہر سے دسویں جماعت کی کتابیں خریدنے گیا کہ اچانک کراس فائرنگ کی زد میں آ گیا اور ایک بے رحم گولی نے اسے ابدی نیند سلا دیا۔ اس طرح نسرین کا اکلوتا سہارا بھی حالات نے اُس سے چھین لیا۔ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کی پرورش اور پڑھائی لکھائی کا خرچہ کون برداشت کرتا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری بلکہ حالات کیساتھ مقابلہ کرنے کے لئے کمر بستہ ہوگئی۔ بس تب سے وہ لوگوں کے کپڑے وغیرہ سلائی کر کے اپنا اور اپنے عیال کا پیٹ پالتی اور چاروں بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ اب جب کہ راحیل نے بارویں جماعت کا سالانہ امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا تھا اس کا ایک ہی خواب تھا کہ راحیل ڈاکٹر بن جائے کیونکہ اس کے مرحوم خاوند کی بھی یہی خواہش تھی۔ اب کے راحیل کو بھی امید تھی کہ وہ ایم، بی، بی، ایس کا امتحان پاس کر لے گا کیوں نہ ہوتی آخر اس نے بھی راتوں کو پڑھ پڑھ کر آنکھوں کی نیند جلائی تھی اور پھر اس کی ماں بھی اس کے لئے رات رات بھر مشین چلا کر محنت کرتی تھی کبھی کبھار اس کی بڑی بہن شائستہ بھی ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتی۔ خدا ہی اس گھر کو چلا رہا تھا ورنہ نسرین بے چاری کون کون سا کونا بھرتی۔ اس کا بھروسہ بھی خدا پر ہی تھا..........آفتاب نے کائنات کی اندھیری چادر کو اپنی نوری شعاعوں سے تار تار کر کے اپنی فتح کا اعلان

کر دیا تو آس پاس کے درختوں پر پرندے اپنی سریلی چہچہاہٹ سے قدرت کی ثناء خوانی میں محو ہو گئے.......... مسجد کی اذان اور مندروں کی گھنٹیوں کی آواز فضا میں عجیب سما پیدا کر کے انسانیت کو جلا بخش رہی تھیں نسرین نے جاء نماز اٹھا کر طاق میں رکھ دی اور رسوئی میں راحیل کیلئے ناشتے کا بندوبست کرنے چلی گئی۔ کیونکہ آج راحیل کو ایم، بی، ایس کا انٹرنس ٹیسٹ دینے شہر جانا تھا.......... ناشتے سے فارغ ہو کر راحیل نے اپنا ضروری سامان اٹھایا اور دروازے پر پہنچ کر ماں سے مخاطب ہوا۔ اچھا امیّ جان میں چلتا ہوں! دعا کرنا میرا پرچہ اچھا ہو جائے۔ راحیل نے رخصت لیتے ہوئے کہا، خدا تمہیں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ نسرین نے آسمان کی طرف دامن پھیلاتے ہوئے کہا، راحیل ایک ٹک اپنی ماں کے اشک آلود چہرے کو دیکھتا رہا۔ دفعتاً نسرین نے پوچھا کیا بات ہے بیٹا؟ آج تو اپنی ماں کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کچھ نہیں امیّ جان! راحیل بھر آئی آنکھوں سے بولا۔ راحیل! بیٹا خیریت تو ہے؟ ماں امیّ جان! بس یونہی ابوُ کی یاد آگئی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو مجھے ٹیسٹ دیتے ہوئے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ وہ رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ جا بیٹا جا۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اس بیوہ ماں اور تینوں بہنوں کی دعا تیرے ساتھ ہے۔ بیٹا شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں بچ کر چلنا اور ٹیسٹ ختم ہوتے ہی سیدھا گھر آجانا۔ امیّ جان آپ فکر بالکل مت کریں۔ میں ٹیسٹ ختم ہوتے ہی سیدھا گھر آجاؤں گا۔ ابھی وہ گیٹ تک ہی پہنچا تھا کہ کھڑکی سے

تینوں بہنوں کی آواز ایک ساتھ آئی، بھائی جان ہماری چوڑیاں یاد ہیں نا؟
اس نے ہاتھ کے اشارے سے پیچھے مڑے بغیر ہی کہا'' ہاں ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ضرور لاؤں گا۔ کہتا ہوا وہ گیٹ سے باہر نکل گیا............''
شہر کے بس اڈے پر اُتر کر وہ سڑک پر چلنے لگا تو شہر کے تمام لوگ اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ دنیا کا کوئی آٹھواں عجوبہ ہو............ وہ شہر کے فیشن ایبل لڑکوں سے بالکل مختلف تھا وہ سادگی پسند تھا۔لباس سے زیادہ وہ پڑھائی پر دھیان دیتا تھا۔تبھی تو اس نے ضلع میں ٹاپ کیا تھا۔اس نے ایک نظر اپنے لباس پر ڈالی۔ اس کے جسم پر ہلکے لال رنگ کی ایک قمیض تھی جس میں مختلف رنگ کے بٹن ٹانکے ہوئے تھے۔ٹانگوں میں ایک سفید رنگ کی میلی سی پتلون چپکی ہوئی تھی۔اس کے لباس سے غربت صاف جھلک رہی تھی۔صورت سے وہ خوبصورت تھا۔اونچا قد، گول مٹول چہرہ، کمان کی طرح سیاہ بھنویں اور نیم سرخ ہونٹ۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا ہو۔امتحانی ہال میں بیٹھ کر وہ سوچوں کے گرداب میں ڈوب گیا...... پرچے میں کیسے سوالات ہونگے......وہ حل کر پائے گا کہ نہیں .... پھر جب پرچہ اس کے ہاتھوں میں آیا تو وہ بے حد خوش ہوا۔اس نے تمام سوالات کے درست جواب لکھ دیئے۔ہال سے باہر نکل کر تمام لڑکے ایک دوسرے سے پرچے کے بارے میں دریافت کرنے لگے کہ کون سے سوالات کیسے کئے۔ایک وہ ہی تھا نہ کسی سے جان نہ پہچان..........وہ چاہتا تھا کہ کوئی اس سے بھی دریافت کرے

لیکن اسے شہر میں کون جانتا تھا۔لیکن وہ مطمئن تھا کہ آج کا ٹیسٹ اچھا ہو گیا۔اب وہ ضرور ڈاکٹر بن جائے گا اور اس کے والدین کا دیرینہ خواب پورا ہو جائے گا۔اچانک اس کا ماتھا ٹھنکا۔اسے بہنوں کی چوڑیاں یاد آئیں پھر وہ بازار سے چوڑیاں خرید کر بس اڈے کی طرف چل پڑا جو یہاں سے کافی دور تھا۔اس نے سوچا بیچ کے راستے سے شارٹ کٹ ہو جائیگا۔وہ اسی راستے پر چل پڑا۔یہ ایک اجاڑ علاقہ تھا جہاں سے صرف بائی پاس گاڑیوں کی آمد ورفت جاری تھی۔ وہ سڑک کے کنارے چلتا ہوا گہرے خیالات میں کھو گیا۔وہ سوچنے لگا کہ پچھلی بار جب وہ خالی ہاتھ گھر لوٹا تو اس کی تینوں بہنیں اس کے ہاتھوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔
اب کی بار اس نے سب کے لئے الگ الگ رنگ کی چوڑیاں خریدی تھیں وہ انہی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ہرے رنگ کی چوڑیاں گن کر ایک ہاتھ میں رکھیں ابھی وہ لال رنگ کی چوڑیاں گن ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار ماروتی گاڑی نے ٹکر ماردی جس سے وہ پلٹے کھاتے ہوئے کافی دور جا گرا اور تمام چوڑیاں ادھر اُدھر بکھر کر رہ گئیں۔راحیل بے ہوش ہو چکا تھا........'' شام کے ملگجی سائے پھیل رہے تھے۔چمگادڑوں کا ایک قافلہ اپنی خوراک کی تلاش میں محوسفر تھا۔سڑک پر گاڑیوں کی آمد رفت جاری تھی۔ہارن کی آواز سن کر راحیل کو ہوش آیا اس نے لڑکھڑاتے ہوئے اپنے گردونواح کا جائزہ لیا۔ بظاہر وہ صحیح سلامت تھا لیکن اس کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا۔اس کو کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے

؟ وہ کہاں جارہا تھا؟ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سڑک کے کنارے پہنچ کر میل کے پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا آسمان کو گھورنے لگا۔ اندھیرے نے کائنات کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سڑک پر سے انگنت گاڑیاں گولی کی رفتار سے گذر رہی تھیں اس نے بہت کوشش کی کہ ہاتھ دینے سے کوئی گاڑی رک جائے۔ لیکن گاڑیوں کی رفتار اس کی سوچ سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ پھر وہ سڑک کے درمیان کسی کھمبے کی مانند کھڑا ہو گیا۔ اچانک ایک ٹرک دور سے بریک لگاتے ہوئے اس کے قریب آکر رک گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں راحیل کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ڈرائیور نے بہت غصے میں کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس سے کہا، کیوں بھئی! مرنے کے لئے میرا ہی ٹرک ملا تھا۔ لگتا ہے زندگی سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ چپ چاپ بت بنا سڑک کے درمیان کھڑا تھا............"

کنڈیکٹر نے ڈرائیور نے کہا، استاد مجھے لگتا ہے یہ گونگا اور بہرہ ہے۔ ہاں چھوٹو مجھے بھی ہی لگتا ہے۔ پھر ڈرائیور نے اس سے کہا، چلو آؤ گاڑی میں بیٹھو! جب وہ کچھ نہ بولا تو کنڈیکٹر گاڑی سے نیچے اتر کر اس کے کان میں زور سے کہا، چلو گاڑی میں بیٹھ جاؤ! پھر وہ بوجھل قدموں سے چل کا گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اور ٹرک کسی نہ معلوم منزل کی جانب چل پڑا............ادھر راحیل کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ اس کی ماں کو بار بار راحیل کے کہے ہوئے الفاظ یاد آرہے تھے کہ وہ ٹیسٹ ختم ہوتے ہی سیدھا گھر لوٹ آئے گا۔ اس کی تینوں بہنیں بھی بھائی کے اچانک لاپتہ

ہونے سے سہم سے گئی تھیں۔اس کی ماں نے تھانے، اخبارات، ریڈیو اور
ٹی، وی ہر جگہ اس کی گمشدگی کی اطلاع دی۔لیکن راحیل کو نہ آنا تھا نہ آیا۔
اس کی بہنیں چوڑیوں کی ضد چھوڑ کر اب بھائی کے غم میں مبتلا تھیں اس کی
ماں نے جوان بیٹے کے غم میں چارپائی پکڑ لی تھی۔وہ ہر وقت ایک ہی بات
کہتی کہ میرا راحیل ضرور آئے گا۔دن گذرتے گئے۔راحیل کا کچھ پتہ نہ تھا
کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا؟ اسی دوران ایم، بی، ایس کے ٹیسٹ
کا نتیجہ بھی نکل آیا۔راحیل کا نام میرٹ میں سب سے اوپر تھا۔اس کی ماں
نے سنا تو اس کی طبیعت بگڑ گئی راحیل کے آنے کی امید کو سینے سے لگائے
ایک دن وہ مالک حقیقی سے جا ملی ...... تینوں جوان بیٹیاں بے سہارا ہو
گئیں۔ان پر پھر ایک بار مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔تمام رشتہ داروں نے
ان سے آنکھیں پھیر لیں شائستہ جوان میں بڑی تھی باری باری تمام رشتے
داروں کے پاس مدد اور پناہ کے لئے گئی مگر ان کی آنکھوں پر چربی چڑھی
ہوئی تھی۔انہوں نے دولت کے آگے رشتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔آخر کار
اپنے نام کی طرح شائستہ نے بڑی شائستگی اور عقل مندی سے کام لیا اور
اپنے بکھرے ہوئے خاندان کو سمیٹا اور ایک اہم فیصلہ کر لیا۔پھر اس نے
حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے کمر کس لی۔جس ٹیلرنگ کام کو وہ شوقیہ طور
پر کیا کرتی تھی اب اس نے اسے ذریعہ معاش بنا لیا اور اپنی دونوں بہنوں کو
تلقین کی کہ وہ خوب پڑھیں۔اب یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے کہ تم
دونوں اچھی تعلیم حاصل کر کے اپنے لئے دو وقت کی روٹی کما سکیں۔اس کی

بہنوں نے بھی شائستہ کی امیدوں پر کھرا اترنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر بالترتیب صبا اور سائمہ نے ڈاکٹر اور ٹیچر بن کر اپنی بہن کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کیا۔ شائستہ بہت خوش تھی کہ آج وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے والدین راحیل کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے شائستہ نے سائمہ کو ڈاکٹر بنا کر ان کے خواب کو پورا کر دیا تھا۔ یہ سب اس کی قربانی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی بھر پور جوانی کو وقت اور حالات کی چکی میں پیس کر انہیں منزل مقصود تک پہنچایا تھا۔ آج جب وہ کسی قابل بن چکے تھے تو تمام رشتے داران سے ناطہ جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن شائستہ کو وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد تھے جب وہ مدد کے لئے در در بھٹک رہی تھی۔ اس نے اپنوں کے بجائے غیروں سے رشتہ جوڑنے میں بہتری سمجھی جنہوں نے برے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس کی مدد کی تھی۔ اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ پھر اس نے صبا اور سائمہ کے ہاتھ پیلے کر کے اپنا فرض نبھایا۔ سائمہ کا شوہر اسی کی طرح ایک ڈاکٹر تھا۔ ندیم اپنے نام کی طرح شریف، ذہین اور ملنسار تھا۔ آج کے سماج میں جہاں لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کے لئے بڑی بڑی مانگیں رکھی جاتی ہیں۔ اس نے سب کچھ ٹھکرا کر ایک عظیم انسان ہونے کا ثبوت دیا اور بغیر جہیز کے اس نے سائمہ کو اپنی شریک زندگی بنایا۔ اس طرح صبا کے خاوند نے بھی اس کے نقش قدم پر چل کر سماج کے بنائے ہوئے رسم ورواج کا منہ توڑ جواب دیا تھا.......... دن گزرتے رہے صبا اور سائمہ اپنے اپنے سسرال میں اپنے شوہروں کے

ساتھ ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھیں...... اتنے ایثار کے بعد بھی شائستہ اپنے مکان میں تنہائی کی زندگی کاٹ رہی تھی۔ لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس نے اپنے سارے فرائض نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے۔ وہ بے حد خوش تھی البتہ کبھی کبھی اسے راحیل کی بے حد یاد آتی کہ اس نے کہا تھا وہ چوڑیاں لے کر لوٹے گا تب اس کی آنکھیں بھر آتیں...... سائمہ کا پاؤں ندیم کے آنگن میں کیا پڑا کہ چاروں طرف خوشیاں رقص کرنے لگیں اور محکمہ نے ندیم کا انتخاب ایم، ایس، کے کورس کے لئے کیا۔ اس طرح سائمہ بھی ندیم کے ساتھ دہلی چلی گئی .... ایک دن اتوار کو ندیم اور سائمہ اپنے کواٹر کی بالکونی میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ اتنے میں وہاں سے ایک چوڑیاں بیچنے والا آوازیں لگاتا ہوا گذرا۔ اس کی آواز سن کر سائمہ کو اپنا بھائی یاد آ گیا جس نے گھر سے نکلتے وقت چوڑیاں لانے کا وعدہ کیا تھا اور آج بیس برس گزرنے کے بعد بھی وہ نہ لوٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ یہ دیکھ کر ندیم نے اسے دلاسہ دیا کیونکہ وہ راحیل کی ساری کہانی سن چکا تھا۔ سائمہ کا دل بہلانے کی غرض سے ندیم نے اسے دہلی گھمانے کا وعدہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں لال قلعے کے آگے کھڑے تھے۔ گھومتے گھومتے وہ جامع مسجد پہنچ گئے۔ پہلے وہ ایک دکان پر کچھ سامان خریدنے کی غرض سے داخل ہو گئے کہ اچانک شیشے کے اندر سے سائمہ کی نظر مسجد کی سیڑھیوں پر پڑی جہاں ایک چوڑیاں والا رنگ برنگی چوڑیاں بیچ رہا تھا۔ مختلف رنگ کی چوڑیاں دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔

اس کے قدم خود بخود اس کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر ندیم بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ چوڑی والے کا چہرہ لمبے لمبے بالوں اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی میں دوبا ہوا تھا۔ ندیم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا، بھئی چوڑیاں کیسے دیں؟ اس نے اپنے پیلے دانت دکھاتے ہوئے کہا بابو جی یہ چوڑیاں تو انمول ہیں۔ ان کا مول، پیار، محبت اور احساس ہے۔ ندیم اس کی باتوں میں الجھ سا گیا۔ چلو بھئی۔ جیسے بھی ہیں ہماری بیگم کا ان چوڑیوں سے پرانا رشتہ ہے ان کی کلائیوں میں پہنا دو ہم بھی دیکھیں وہ کیسی لگتی ہیں؟ کس رنگ کی پہنیں گی بہن جی؟ چوڑی والے نے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے پوچھا، ارے بھئی! نئی نویلی دلہن کس رنگ کی چوڑیاں پہنتی ہیں۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؟ بابو جی! اپن تو تین ہی رنگ کی چوڑیاں بیچتا ہے۔ لال، ہرے اور نیلے رنگ کی.........سائمہ ہمہ تن گوش چوڑی والے کی باتیں سن رہی تھی۔ چلو بھئی لال رنگ کی ہی پہنا دو! چوڑی والے نے لال رنگ کی چھ چوڑیاں لے کر سائمہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جونہی اس نے سائمہ کی کلائی کو چھوا تو دونوں کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یہ دیکھ کر ندیم کو چوڑی والے کی نیت پر کچھ شبہ ہوا تو وہ بولا یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ نہیں صاحب! وہ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے بولا، سائمہ کو بھی عجیب سا لگا۔ چوڑی والے نے ایک بار پھر ہمت کر کے سائمہ کی کلائی کو چھوا تو پھر ایک جھٹکے نے دونوں کو الگ کر دیا۔ اس نے ایک دم سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور زور سے اپنے بالوں کو پیچھے جھٹک دیا۔ دفعتاً سائمہ کی نظر اس کے چہرے پر لگے ہوئے نشان پر

پڑی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، بھائی جان ......!!! یہ سن کر چوڑی والا پیٹھ کے بل گر پڑا.......... اور بیہوش ہو گیا اتنے میں وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔

ندیم نے اسے لوگوں کی مدد سے اسپتال پہنچایا۔ جہاں چند گھنٹوں میں کچھ انجکشن دینے کے بعد اسے ہوش آیا۔ وہ زور سے چلایا۔ سائمہ!! میری بہن سائمہ اور اسے گلے سے لگالیا۔ پھر اس نے انہیں سارا قصہ سنایا کہ کس طرح وہ یہاں پہنچا۔ یہ روداد سن کر ندیم کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ سائمہ کی خوشی کو کوئی ناہی نہیں تھا پھر ندیم اور سائمہ اسے اپنے گھر کشمیر لے آئے اس کی واپسی کی خبر سن کر وہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کے گھر پر لوگوں کا جم غفیرا اکٹھا ہو گیا۔ راحیل نے شائستہ کے حوصلے اور ہمت کی داد دی ماں کو یاد کر کے اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں ہو گیا۔ اس نے خود کو شائستہ سے الگ کیا اور اپنے بیگ میں لال رنگ کی چوڑیاں شائستہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ دیکھو باجی! میں تمہارے لئے چوڑیاں لایا ہوں وہ دیوار کیساتھ ساکت کھڑی تھی۔ جب راحیل نے چوڑیاں چھنکائیں تو شائستہ نے چوڑیاں ہاتھوں میں لیکر زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ ہاہاہاہا.......... اب میں بھی چوڑیاں پہن کر دلہن بنوں گی۔ وہ دیکھو برات آ گئی۔ سب لوگ اسے حیرت زدہ نظروں سے تک رہے تھے وہ پاگل ہو چکی تھی۔

..........☆☆☆..........

محبت ایسی دھڑکن ہے

ساون کا پر لطف مہینہ تھا آسمان سے ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار جاری تھی شام کے چھ بجنے کو تھے درختوں کے پتے پانی میں نہائے ہوئے ہوا سے محو گفتگو تھے دور کہیں پپیہا پیوں پیوں کر رہا تھا شاید وہ اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کو سریلی آواز میں پکار رہا تھا۔ امی جان آرام دہ کرسی پر بیٹھی کسی تاریخی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی خالد اپنی خواب گاہ میں پلنگ پر اوندے منہ پڑا ہوا تھا چونکہ اتوار کا دن تھا اور یہ دن تو ہفتے میں ایک بار آتا ہے کاروبار کے سلسلے میں ادھر ادھر مغز ماری کر کے ''خالد'' تنگ آجاتا اور آج وہ ساون کی رم جھم کا بھر پور لطف لے رہا تھا جب امّی جان اسے جگا کر آتی تو وہ پھر کروٹ بدل کر سو جاتا تنگ آکر امّی نے کہہ دیا.........اب نہیں اٹھاؤں گی چاہیے رات ہی کیوں نہ ہو جائے...........امی جان کتاب پڑھنے میں اس قدر مہنمک تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک اس کے

کانوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی دستک اور تیز ہوگئی تو امیّ جان کو مجبوراً اُٹھنا
پڑا اس نے نشان کے طور پر ورق تہہ کر کے کتاب میز پر رکھ دی اور بڑ بڑاتے
ہوئے دروازے کی جانب بڑھی..........نہ جانے کون کمبخت ہے ایتوار
کے دن بھی آرام نہیں ان کو.........تھوڑا سا مزا آیا تھا سارا مزا ہی کر کرا ہو گیا
جونہی اس نے دروازہ کھولا تو ٹھٹھک گئی..........ارے
تو..........آ آ..........اندر آ بیٹا تو تو بھیگ گیا ہے وہ کمرے میں داخل ہو
گیا..........آواز سن کر خالد کی آنکھ فوراً کھل گئی کون ہے امی
جان..........کوئی پولیس انسپکٹر ہے..........پولیس انسپکٹر خالد نے حیرانگی
سے پوچھا ہاں پولیس انسپکٹر..........پولیس کا کیا کام یہاں خالد بستر
سے اُٹھتے ہوئے بولا..........کہتا ہے خالد سے ملنا ہے..........خالد نے
کرتا پہنا اور بڑے غصے میں دروازے تک آیا..........کون ہے بھائی؟ کیا
کام..........وہ اتنا ہی کہہ سکا ارے تو کہہ کر وہ طاہر سے لپٹ گیا امی نے تو
مجھے ڈرا ہی دیا تھا..........کب آیا..........اور سنا کیسا ہے تو؟ ہماری یاد آتی
تھی کہ نہیں خالد نے سوالات کی بوچھاڑ کر ڈالی ....بس آپ لوگوں کی
دعا ہے تو مجھے کانٹا بھی نہیں چُبھ سکتا طاہر نے بالوں کا پانی جھاڑتے ہوئے کہا
اچھا امیّ جان آپ چائے لے کر آؤ تب تک طاہر کپڑے تبدیل کرتا ہے کہہ
کر خالد اور طاہر دوسرے کمرے میں چلے گئے خالد نے کمرے کی تمام
کھڑکیاں کھول دیں اور غور سے طاہر کو دیکھتے ہوئے بولا..........طاہر کیا
خوب سجی ہے تیرے جسم پر یہ خاکی وردی ستاروں نے تو اور بھی اضافہ کر دیا

ہے اس کی خوبصورتی میں ....طاہر قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے بولا.......... یہ سب تمہاری قربانی کا نتیجہ ہے نہ تو اس وقت میری مدد کرتا نہ میں اس مقام پر پہنچتا..........تو مجھے شرمندہ کرر ہا ہے خالد سگریٹ کا دھواں ہاتھ سے ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے بولا..........اتنے میں امّی جان چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو خالد نے فوراً سگریٹ پاؤں کے نیچے مسل ڈالا اور دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے......

طاہر کے ماں باپ بچپن میں ہی اسے تنہا چھوڑ کر ملک عدم سدھار گئے تھے اور وہ ایک یتیم خانے (آشرم) میں رہ رہا تھا اور خالد اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا اکلوتا لڑکا تھا اس کا باپ ایک بہت بڑا ٹھیکے دار تھا اسکول سے لے کر کالج تک دونوں اکھٹے پڑھے دونوں میں گہری دوستی تھی خالد کی ماں اسے اپنا دوسرا بیٹا سمجھتی تھی..........کالج میں پہنچ کر ان کی دوستی ایک خوبصورت بلا شگفتہ سے ہوگئی..........شگفتہ بڑی ضدی اور مغرور لڑکی تھی وہ اپنے اوپر مکھی تک نہ بیٹھنے دیتی لیکن خالد اور طاہر دونوں کافی مزاحیہ قسم کے لڑکے تھے رفتہ رفتہ دونوں نے اپنی باتوں سے اسے پگھلا دیا اور پھر وہ ہمیشہ ان دونوں کے ساتھ بیٹھتی کالج کے لڑکے لڑکیاں کیا کہتے ہیں اس کی اسے ذرا بھی پرواہ نہیں تھی طلباء حیران تھے کہ وہ ان کے ساتھ کیسے گھل مل گئی تینوں بی، اے کے فائنل ایئر میں تھے نتیجہ نکلا تو طاہر نے پورے کالج میں امتیازی نمبر حاصل کئے تھے خالد اور شگفتہ بڑی مشکل سے پاس ہوئے تھے کیونکہ وہ تو کالج میں دل کی کتاب پڑھنے میں مصروف رہتے

تھے لیکن اس بات سے طاہر بالکل بے خبر تھا.......... ہفتے.......... مہینے
.... سال گزرتا گیا اسی دوران طاہر نے پولیس انسپکٹر کی پوسٹ کے
لئے انٹرویو دیا تھا لیکن سلیکشن کے لئے دو لاکھ رشوت کی ضرورت تھی دو
لاکھ کا نام سن کر طاہر کے سبھی ارمان ٹھنڈے پڑ گئے جب خالد کو اس بات کا
علم ہوا تو اس نے ماں سے دو لاکھ لے کر طاہر کو دے دئے کیونکہ خالد کو
نوکری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے پاس باپ دادا کی جائید دہی بہت تھی
اس نے سوچا چلو کسی کی زندگی سنور جائے تو بہت ہے اور پھر طاہر پولیس کی
ٹرینگ کیلئے چلا گیا آج تین سال کے عرصہ کے بعد اپنے شہر میں تھانے
دار کے عہدے پر فائز ہو کر آیا تھا طاہر دل ہی دل میں شگفتہ کو بہت چاہتا تھا
لیکن اظہار محبت سے کترا رہا تھا اسے یقین تھا کہ ایک دن خود ہی شگفتہ اس
کی محبت کا اقرار کرے گی اگر کالج میں شگفتہ اسے نہ ملی تو اس کا بی اے کرنا
مشکل تھا وہ تو اسے دیکھ کر ہی جیتا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ شگفتہ
نے اپنی زندگی خالد کے نام لکھ دی ہے وہ خالد پر جان چھڑکتی تھی وہ خالد
کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی اکثر دونوں مکان کی چھت پر چڑھ کر
اشاروں اشاروں میں داستان لیلا مجنون مکمل کرتے.......... شگفتہ کا باپ
بزنس مین تھا ان کا شہر میں کافی نام تھا شگفتہ کے باقی بہن بھائی اس سے
چھوٹے تھے.......... ایک دن موقعہ دیکھ کر طاہر نے امیّ جان سے مکھن
لگاتے ہوئے کہا.......... امّی جان اب آپ بہت تھک جاتیں ہیں خالد
کے لئے کوئی اچھی سی دلہن لے آیئے نا.......... ماں نے اسے سمجھایا کہ

خالد نے آج تک اسے اپنی پسند نہیں بتائی وہ تو اپنا کاروبار بیرون ملک
تک پھیلانا چاہتا ہے ہاں اگر تو کوئی لڑکی بتائے تو میں تیرے لئے رشتہ کی
بات چلاؤں طاہر کا دل خوشی سے اچھلنے لگا اس نے سوچا لوہا گرم ہے ہتھوڑا
مارنا چاہیے وہ شرماتے ہوئے بولا امّی جان جہاں میں بتاؤں گا کیا آپ
وہاں میری شادی کرائیں گی.......... تو بتا تو سہی،، بتاؤں.......... ہاں
ہاں بتاؤ.......... امّی جان اس کا نام ہے ش.......... ش.......... شگفتہ اتنا
کہہ کر اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گیا..........
جب امّی جان خان صاحب کے گھر طاہر کے رشتے کی بات کرنے گئی تو
خان صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کا بیاہ ایک پولیس
والے سے ہرگز نہیں کریں گے انہیں پولیس والوں سے سخت نفرت تھی
انہیں اچھی طرح یاد تھا جب ان کی شریکِ حیات کا کسی نے قتل کر کے روپیہ
لوٹ لیا تھا تب وہ تھانے میں رپورٹ درج کرانے گئے تو تھانیدار نے
تفتیش کرنے کے لئے دس ہزار روپے مانگے کہ پھر وہ ملزم پر ہاتھ ڈالیں
گے بس تب سے وہ پولیس والوں کے دشمن بن گئے تھے امّی جان نے لاکھ
سمجھایا کہ اس تھانیدار کے جرموں کی سزا طاہر کو نہ دیں لیکن وہ اپنے
ارادے پر اٹل رہے کافی بحث کے بعد خان صاحب نے امّی سے
کہا.......... بہن آپ پہلی بار میرے گھر آئی ہیں میں آپ کو خالی ہاتھ لوٹانا
نہیں چاہتا.......... ہاں اگر آپ رشتہ کرنا ہی چاہتی ہیں تو میں خالد کے
لئے رشتہ دے سکتا ہوں وہ مجھے پسند بھی ہے شگفتہ جو دروازے کے اوٹ

سے سب کچھ سن رہی تھی خوشی سے جھوم اٹھی.......... امّی جان شش و پنج میں پڑ گئی انہوں نے خان صاحب سے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے گی پھر بھی وہ طاہر پر غور کریں تو خان صاحب بھڑک اٹھے.........سب پولیس والے ایک جیسے ہوتے ہیں.......... امّی جان نے خالد سے جب رشتہ کے بارے میں پوچھا تو وہ بھلا کیوں انکار کرتا اسے تو بن مانگے موتی مل رہے تھے وہ مان گیا جب اس ساری بات کا پتہ طاہر کو چلا تو اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے اس کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوئے وہ سوچنے لگا شاید اسی لئے خالد نے اس کی مدد کی تھی تا کہ وہ ان سے دور رہے اسے یہ شک بھی ہوا کہ ضرور امّی نے خالد کی تعریف زیادہ کی ہوگی محبت کا واسطہ دیا ہوگا۔ سوچتا کاش وہ خالد احسانوں کے تلے نہ دبا ہوتا تو وہ یہ رشتہ ہرگز نہ ہونے دیتا آخر اس نے شگفتہ سے محبت کی تھی اس نے کتنی محنت کی ہے شگفتہ کی برابری کرنے کے لئے.......... وہ دن رات حسد کی آگ میں جلنے لگا خالد کے گھر اس کا آنا جانا بھی کم ہو گیا پوچھنے پر طاہر کہتا آج کل کام بہت ہے خالد کی سگائی میں بھی وہ شریک نہیں ہوا جب خالد نے اسے سگائی کی مٹھائی کھلانی چاہی تو طاہر نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ڈاکٹر نے اسے مٹھائی کھانے سے منع کیا ہے۔

بیچارہ خالد اس کے دل کی کیا جانے وہ تو اس معاملے سے بالکل بے خبر تھا.......... طاہر کو خالد سے سخت نفرت ہو چکی تھی کہ اس نے دھوکے سے اس کی محبت چھین لی وہ سوچنے لگا خالد کے روپے تو اس نے کب کے

لوٹا دیئے ہیں پھر احسان کیسا۔ پھر احسان کے بدلے میں کوئی اپنی محبت تو
نہیں بیچ دے گا وہ "شگو" کو ہر حال میں حاصل کرے گا چاہے اسے کچھ بھی
کرنا پڑے.......... محبت چھن جانے کے غم نے اسے وحشی درندہ بنادیا تھا
اسے اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز نہیں رہی اس کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا
وہ خالد سے بدلہ لینے کی سوچنے لگا.......... ایک دن شگفتہ بازار سے پیدل
گھر آرہی تھی کہ اتنے میں طاہر جیپ لے کر وہاں سے گذرا تو شگفتہ کے
پاس پہنچ کر اس نے جیپ روک دی اور شگفتہ سے التجا کی کہ وہ جیپ میں
بیٹھ جائے وہ اسے گھر تک چھوڑ دے گا شگفتہ نے سوچا یہ خالد کا جگری
دوست ہے تو وہ جیپ میں بیٹھ گئی تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد "طاہر"
نے خاموشی کو توڑا.......... شگو.......... تمہارے باپ نے میرا رشتہ کیوں
ٹھکرادیا؟ طاہر نے جیپ کا اسٹرینگ گھماتے ہوئے پوچھا.......... مجھے
کیا پتہ   شگفتہ نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا.......... تم جھوٹ
بولتی ہو.......... میں جھوٹ کیوں بولنے لگی.......... طاہر الٹے سیدھے
سوال شگو سے کرنے لگا شگو.......... خالد میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں
ہے سب کچھ ہے میرے پاس میری جان سب کچھ اتنا کہہ کر طاہر نے
شگفتہ کے زانوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو شگفتہ سٹپٹا گئی اس نے طاہر کا ہاتھ زور
سے جھٹک دیا طاہر نے پھر بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو شگفتہ نے ایک
زوردار طمانچہ   اس کے گال پر رسید کر دیا اور چلتی ہوئی جیپ سے کود کر
ایک گلی میں گھس گئی طاہر گال سہلاتا رہ گیا اسے ڈر تھا کہ شگفتہ خالد کو سب

کچھ نہ بتادے..........شگفتہ نے خالد کے گھر ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں دہلی گیا ہوا ہے۔ شگفتہ نے سندیش رکھا کہ جس وقت خالد آئے تو اسے کہنا مجھے میرے گھر پر ملے اسی شام شہر میں نفرت کی آگ پھیل گئی جس سے انسانیت جل کر راکھ ہوگئی۔ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا آگ کے شعلے آسمان کو چھونے لگے تشدد آمیز واقعات کے بعد شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا اور دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہوا..........کرفیو دوسرے دن بھی مسلسل جاری رہا شہر میں نیم فوجی دستے اور پولیس کے جوان گشت کر رہے تھے شہر کی بجلی کاٹ دی گئی ....خالد کو ریلوے اسٹیشن پر روک دیا گیا اور پھر پولیس نے اسے اور باقی مسافروں کو گھر تک پہنچایا ....گھر پہنچ کر خالد کو شہر کے حالات کے بارے میں امی جان سے معلوم ہوا ....کھانا کھانے سے پہلے ہی امی جان نے خالد کو بتایا کہ شگفتہ کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ خالد جس وقت بھی آئے تو شگفتہ کے گھر فوراً پہنچ جائے اتنا سننا تھا کہ خالد مکان کے پچھواڑے سے نکل کر ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا وہ سوچنے لگا نہ جانے کیا بات ہے جو شگفتہ نے اسے فوراً بلایا۔

طاہر جسے یہ ڈر تھا کہ کہیں شگفتہ خالد کو سب کچھ نہ بتادے نزدیک والے چوک سے یہ منظر دیکھ رہا تھا وہ پریشان ہو گیا خالد تیز تیز چلتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھ رہا تھا وہ اب شگو کے گھر سے تھوڑا ہی دور تھا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اچانک خالد نے دوڑنا

شروع کر دیا وہ گھبرا گیا چونکہ شہر میں دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم تھا خان صاحب کے کمپونڈ کا گیٹ بند تھا وہ بدحواسی میں دیوار پھاندنے لگا اس کا آدھا حصہ دیوار پر تھا اور نچلا حصہ دیوار سے نیچے لٹک رہا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کی پیٹھ میں سے جا کر سینے سے باہر نکل گئی پھر یکے بعد دیگرے پانچ فائر ہوئے گولیوں کی آواز رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی دور تک گونج گئی۔ دیوار خالد کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور خالد ایک دلخراش چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ طاہر نے اپنی پستول کی نالی سے نکلتے ہوئے دھویں کو پھونک ماری۔

............☆☆☆............

آخری چنار

یہ ایک بہت بڑا گاؤں تھا جس میں تقریباً دو سو سے زائد رہائشی مکان تھے۔اس گاؤں کو لوگ عموماً ''چنار گام'' کے نام سے پکارتے تھے۔اس گاؤں کے ایک طرف سے صاف وشفاف ندی بہتی تھی۔اس پر ایک جھولا پل بندھا ہوا تھا جو اس گاؤں کو سرینگر جانے والی سڑک سے ملاتا تھا۔اس گاؤں کی دوسری طرف دو خوبصورت اور دلکش چوٹیاں اس طرح ملی ہوئی تھیں جیسے دو جواں دھڑکتے دل آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں ان چوٹیوں کے درمیان سے صاف وشفاف پانی کا ایک جھرنا بہتا تھا۔ جو آگے جا کر اس ندی سے مل جاتا تھا ندی کا یہی پانی آگے چل کر چھوٹی چھوٹی نہروں میں تقسیم ہو جاتا جو اس گاؤں کے کھیتوں کو سیراب کرتا' اس گاؤں کی مٹی کافی زرخیز تھی اور اس گاؤں کے لوگ کافی محنتی بھی تھے' ہر قسم کی فصل' ہر قسم کا پھل اور سبزیاں اس گاؤں

سے شہر میں فروخت ہوتیں یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش تھا جو کام ان کے آباؤ اجداد کرتے آئے تھے اس کام کو یہ لوگ کیسے ترک کر دیتے............کھیتی باڑی تو اس گاؤں کی سب سے بڑی جاگیر تھی ہر سال گرمیوں میں یہاں ہزاروں سیاح آتے اور کئی دنوں تک نزدیکی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے اس گاؤں کی خوبصورتی کے عکس کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیتے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے......
اس گاؤں کی خوبصورتی کا راز تھا یہاں کے وہ چنار جو اپنی خوبصورتی سے اس گاؤں کی رونق کو دوبالا کرتے تھے، یہاں کے کسان ہر برس ہزاروں چنار کے درخت لگاتے، یہی چنار خزاں کے موسم میں انہیں بہت کام دیتے جن کے سوکھے ہوئے پتوں کو آگ بنا کر وہ لوگ اپنی کانگڑی میں استعمال کرتے یہاں کی مچھلیاں بھی کافی مشہور تھیں اکثر سیاح لوگ اپنے ساتھ یہی مچھلیاں سوکھا کر تحفے کے طور پر لے جاتے............اسی گاؤں کے وسط میں چار کمروں پر مشتمل ایک مکان (جو کہ سارا لکڑی کا بنا ہوا تھا) نور محمد کا تھا اس کے باپ دادا کی کافی اراضی تھی جس پر وہ خود کاشت کرتا تھا اس کے دادا کی اتنی جاگیر تھی کہ پورا گاؤں بسایا جا سکتا تھا لیکن عیاشی میں اس کے دادا نے بہت سی جائیداد فروخت کر دی وہ زندہ دل انسان تھے۔

نور محمد کی شادی اسی گاؤں کی ایک الھڑ دوشیزہ زیبا سے اس کے والدین نے کر دی نور محمد کی شادی کے پانچ سال بعد اس کے والدین یکے

بعد دیگرے اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئے باوجود اس کے نور محمد کی کوئی اولاد نہ تھی پھر بھی وہ خاموش تھا اس کی ازدواجی زندگی بڑے مزے سے گذر رہی تھی اسے اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ تھا............نور محمد نے گھر پر ہی قالین بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ کھولا تھا وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور دن بھر اپنی فصل وزمین کی دیکھ بھال کرتا............آج بھی وہ صبح سویرے ہی گھر سے نکل کران پانچ چناروں کو پانی سے سینچنے لگا جو اس نے کچھ دنوں قبل لگائے تھے چونکہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اسی لئے اسے چنار کے درخت لگانے کا بیحد شوق تھا وہ انکی پرورش اپنی اولاد کی طرح کرتا ویسے تو اس نے زمین کے گرد بہت سے چنار ایک قطار میں لگائے تھے لیکن ان پانچ چناروں کو تو نور محمد اپنی اولاد تصور کرتا تھا اس نے زیبا سے پوچھ کرانکے نام بھی رکھ دیئے تھے۔

بلال، شبیر، فاروق، شہباز اور شاداب نور محمد بڑے پیار سے انہیں پانی دیتا سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتا کہ کسی کو سوتیلے پن کا احساس نہ ہو نور محمد دور کی سوچتا وہ سوچتا کل جب یہی چنار بڑے ہوں گے تو اس گاؤں کو ہی نہیں پورے کشمیر کو رونق بخشیں گے اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ چنار کے درخت اپنی جڑیں زمین میں پوری طرح پھیلا چکے ہیں اس کے مکان کے قریب ہی ایک چالیس سالہ چنار جو کبھی اس کے دادا نے لگایا تھا اب کافی پھیل چکا تھا جس پر سینکڑوں پروں نے اپنا نشیمن بنایا تھا نور محمد یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور اپنے دادا کو دعا دیتا اگر اس نے چنار کا درخت نہ

لگایا ہوتا تو کیسے ان سینکڑوں پنچھیوں کو گھر ملتا .... وہ اپنے دادا کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ گاؤں کے پرانے بزرگوں کا کہنا تھا کہ اس کے دادا نورالدین کو چنار کے درخت لگانے کا بہت شوق تھا اور جب اس کا دم نکلا تو تب بھی وہ ایک چنار کے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا جس سے اس درخت کے ساتھ اس کی محبت کی انتہا معلوم ہوتی تھی............ جب بھی نور محمد سرینگر جاتا تو سڑک کے کناروں پر لگے ہوئے چناروں کو دیکھ کر سوچتا کہ یہ چنار ہی اس کشمیر کے جوان بیٹے ہیں۔ ان سے ہی کشمیر کا حسن نکھرتا ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر ڈر جاتا اور گہری سوچ میں ڈوب جاتا کہ اگر کبھی ان چناروں کے سوکھے ہوئے پتوں میں کسی دشمن نے چنگاری پھینک دی تو نہ جانے ان سے نکلنے والی چنگاریاں کہاں کہاں تک پہنچیں گی۔ اگر یہ چنگاریاں اس کے گاؤں تک بھی پہنچ گئیں تو اس کے لگائے ہوئے چناروں کا کیا ہوگا وہ پانچ چنار جن کو اس نے اور ''زیبا'' نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔

بلال شبیر فاروق شہباز اور شاداب'' کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ پھر وہ سر کو زور سے جھٹک دیتا............ نہیں نہیں............ وہ بھی کیا سوچنے لگا............ یہ کیسے ہوسکتا ہے............ بازار سے ضرورت اشیاء کا سامان خریدنے کے بعد وہ تانگے پر سوار ہو گیا............ تانگہ پوری طرح سواریوں سے بھر چکا تھا .... تھوڑی دیر کے بعد گھوڑا گاؤں کی کچی سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ جونہی نور محمد کا گھر نزدیک آیا۔ اس نے تانگے سے اتر

کرتا نگے والے کو دو روپے تھما دئے اور خود گھر جانے کے بجائے وہ سیدھا اپنے کھیتوں میں چلا گیا وہ اپنے ان پانچ چناروں کے پاس کھڑا تھا جن کو وہ اپنی اولاد تصور کرتا تھا اس کے ذہن پر ابھی تک شہر کے خیالات کا اثر باقی تھا وہ کافی ڈر چکا تھا۔ اس نے باری باری سارے چناروں کو اپنے ہاتھوں سے چھوا شاداب کو وہ کافی دیر تک سہلاتا رہا جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے چنار صحیح سلامت ہیں تو وہ مطمئن ہو کر گھر چلا گیا.......... زیبا نے اس کے ہاتھ سے بازار سے لایا ہوا سامان لے لیا زیبا کو نور محمد کی تھکاوٹ کا احساس ہو گیا۔ ابھی نور محمد بیٹھا ہی تھا کہ زیبا نے اس کے آگے نمکین چائے سے بھرا ہوا سماوار پیالی اور چند لواسے رکھ دیئے۔ نور محمد دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کتنا خیال رکھتی ہے ''زیبا'' اس کا.......... کتنا پیار کرتی ہے اسے.......... کتنی خدمت گذار ہے.......... شاید خدا نے عورت کا وجود ہی اسی لئے بنایا ہے .... ہمارے بیٹوں کا کیا حال ہے ؟ اچانک زیبا نے سوال کیا۔ ابھی ابھی وہاں سے ہی تو آرہا ہوں نور محمد چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولا۔ یہ سن کر زیبا پریشان ہوگئی اور پوچھ بیٹھی آپ تو سرینگر گئے تھے۔ ہاں ہاں سرینگر سے واپسی پر میں وہاں بھی گیا تھا......

کیوں..........؟ کل چلے جاتے.......... نور محمد نے چائے کی پیالی نیچے رکھتے ہوئے کہا زیبا میں تمہیں کیا بتاؤں.......... شہر کے حالات دیکھ کر مجھے ڈر سا لگ گیا تھا اور میرے بوڑھے دماغ میں طرح طرح کے

خیالات جنم لینے لگے پھر آج کل شہر کی فضا بھی کچھ بدلی ہوئی ہے.........
بھائی سے بھائی محفوظ نہیں اور باپ سے بیٹا۔ وہاں کی ہوا سے مجھے نفرت کی
بو آرہی تھی اسی لئے میں اپنے چناروں کو دیکھنے چلا گیا تھا اتنا کہہ کر نور محمد
نے حقہ منہ میں دبالیا۔ تم بھی کیا عجیب قسم کے آدمی ہو۔ ساٹھ سال کے ہو
گئے لیکن ابھی تک بچّوں والی باتیں کرتے ہو زیبا چائے کے برتن سمیٹے
ہوئے بولی.......... آج صبح سویرے ہی نور محمد اپنے مکان کے قریب
اپنے دادا کے ہاتھ سے لگائے ہوئے چنار کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو
اس کے دادا نے نور محمد کی پیدائش کے وقت آج ہی کے دن لگایا
تھا.......... موسم خزاں کی آمد تھی چناروں کے پتے پوری طرح زرد ہو چکے
تھے.......... رفتہ رفتہ چمگادڑ بھی اس گاؤں سے رخصت ہو رہے تھے۔
گاؤں کی لڑکیاں پتوں کو سمیٹ کر ٹوکریوں میں بھرتیں اور ایک قطار میں
ندی کے کنارے کنارے اپنے گھروں کی طرف چل پڑتیں۔ ندی کے
قریب ہی کچھ مویشی چارہ چر رہے تھے۔ ندی کی سطح پر لہریں بن اور بگڑ
رہی تھیں اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر نور محمد بہت خوش ہو رہا تھا اسی گاؤں
میں کبھی وہ بھی چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ چنار کے پتوں کو جلا کر
آگ تاپتا تھا لیکن اب اسے آگ سے سخت نفرت ہو چکی تھی۔ چلتے چلتے
اچانک نور محمد کی نظر اپنے چنار بلال پر پڑی تو وہ چونک گیا اس کے اوسان
خطا ہو گئے بلال کو کسی نے جڑ سے کاٹ دیا تھا۔ نور محمد کی آنکھوں میں موتی
چھلکنے لگے اس کو لگا جیسے اس کا ایک بازو کٹ گیا ہو۔ آج پورے دن نور محمد

اور زیبا نے کچھ نہیں کھایا۔ دوسرے دن جب وہ پھر کھیتوں میں گیا تو اس
کی حیرانگی کی حد نہیں رہی آج پھر کھیتوں میں گیا تو اس کی حیرانگی کی حد نہیں
رہی۔ آج پھر کسی ظالم نے اس کے دو چناروں فاروق اور شبیر کو کاٹ
دیا تھا۔ نور محمد کی ٹانگوں سے جان نکل گئی اسے دھچکا لگا جیسے اس کی کمر ٹوٹ
گئی ہو ایک تو پہلے ہی وہ ناتواں تھا دوسرا یہ صدمہ.......... وہ آہستہ آہستہ
گھر تک پہنچا اس کا دل کہیں نہیں لگ رہا تھا دل بہلانے کے لئے اس نے
ریڈیو پر خبریں سننے میں بہتری سمجھی۔

خبریں سنتے سنتے اچانک وہ چونک پڑا کیونکہ شہر کی حالت کافی
نازک تھی اسے تشویش ہوئی وہ ان چناروں کے بارے میں سوچنے لگا
جنہیں اس نے سرینگر میں سڑکوں کے کنارے کشمیر کی نوجوان نسل کے
روپ میں دیکھا تھا اب تو ان چناروں کے پتے پوری طرح سوکھ چکے
تھے.......... دوسری صبح جب کسی پڑوسی نے نور محمد کو یہ منحوس خبر سنائی کہ اس
کے بقیہ چناروں شہباز اور شاداب کو بھی کسی بے رحم نے کاٹ ڈالا ہے تو وہ
چکرا گیا وہ سوچنے لگا آخر وہی ہوا جس کا اُسے خدشہ تھا شہر کی آگ دھیرے
دھیرے ادھر بھی پھیلنے لگی وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر سوچنے
لگا کہ کشمیر کے ان چناروں سے کسی کو کیا دشمنی تھی۔ وہ تو تپتی دھوپ میں تھکے
ماندے مسافروں کو راحت بخشتے تھے۔ ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر مسافروں
کو تسکین ہوتی تھی۔ اس کی سوچ نے پھر پلٹا کھایا ضرور کسی دشمن نے
چناروں کے سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر ان میں چنگاری پھینک دی لیکن

کل یہی آگ اسکے اپنے گھر تک پہنچے گی شاید وہ نہیں جانتا کہ چناروں کی آگ کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ کشمیر کے کتنے ہی چنار دشمن نے کاٹ کر پھینک دیئے ہوں گے.......... باہر زور کی آندھی چل رہی تھی نور محمد نے زیبا سے کانگڑی لی اور پھر ''زیبا'' کے نزدیک ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اتنی دیر میں اس کا ہم عمر چنار زمین سے اپنی جڑیں چھڑا کر سیدھا نور محمد کے مکان پر جا گرا۔ پھر ایک دم سناٹا چھا گیا اس طرح نور محمد کے دادا کی آخری نشانی بھی ختم ہوگئی۔

..........☆☆☆..........

راکھ ارمانوں کی

اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کی زندگی میں ایسا بھی دن آئے گا جب وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہوگا جہاں پرائے تو پرائے اپنے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کی خوشگوار زندگی میں دفعتاً بھونچال آجائے گا۔ جو خواب اس نے اپنی آنکھوں میں سجائے تھے اُن کا شیرازہ بکھ جائے گا والد کی وفات کے بعد اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کمپنی کے مالک اور افسران نے اُن سے آنکھیں پھیر لیں۔ کمپنی کی طرف سے دیا ہوا فلیٹ بھی چھوڑنا پڑا۔ اس کی ماں نے ہاتھ جوڑے منتِ سماجت کی لیکن کمپنی کے مالکان ہور افسران پر ان کی التجا کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کمپنی سے وفاداری اور ایمانداری کا کیا صِلہ ملا انہیں؟ یہی کہ زندگی کے بقیہ ایام پہاڑ کی طرح کاٹنے پڑے۔ کافی کوششوں کے بعد ایک آدمی نے انہیں ترس کھا کر سر چھپانے کے لئے نزدیکی گاؤں میں ایک ہال نما کمرہ کرائے پر دلا دیا۔

دونوں ماں بیٹے وہیں رہ کر گزر بسر کرنے لگے۔ باپ کے جیتے جی اس نے انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ گھر کا خرچہ چلانے کے لئے کچھ نہ کچھ کام دھندہ کرنا بھی لازمی تھا۔ اس لئے اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ کالج کی کینٹین میں ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ لیکن نوکری کی تلاش بھی ضروری تھی۔ دن بھر وہ کام کے ساتھ ساتھ اخبارات میں خالی اسامیوں کے کالم بھی تلاش کرتا اور پھر دوسرے ہی دن فارم پُر کر کے متعلقہ محکمہ کو بھیج دیتا اسی طرح وہ نوکری کی تلاش میں بھٹکتا رہا لیکن ہر جگہ اس کی مفلسی آڑے آتی۔ رشوت کی رقم دینے سے وہ قاصر تھا۔ ایم اے کی ڈگری تو محض کاغذ کا ٹکرا ثابت ہوئی۔ صبح سویرے ہی وہ اپنے سارے سرٹیفکیٹ اٹھائے گھر سے نکلتا تو شام کو اپنا سامنہ لے کر واپس لوٹ آتا۔ ایک طرف نوکری کی فکر تو دوسری جانب ماں کی مہلک بیماری کا غم۔ وہ درجہ فہرست اور درجہ ذات قبائل کی چکی میں پل پل پس رہا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ گھر سے نکل پڑا۔ مین بس اڈے پر پہنچ کر وہ فوراً نکلنے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جلدی سے جلدی انٹرویو کے لئے پہنچنا چاہتا تھا وقت تھا کہ گھٹتا ہی جا رہا تھا۔ آج شام جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو شہر کے چوک میں پہنچ کر اُسے کافی تھکن کا احساس ہوا۔ جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ دن بھر پیدل چلتا رہا۔ اس کے بالوں پر سڑکوں کی دھول اور گاڑیوں کے دھوئیں نے اپنا رنگ جما دیا تھا۔ صبح سے اس کے حلق میں سوائے چند دانے اناج کے کچھ بھی نہ گیا تھا۔ پیاس

کے مارے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور ہونٹ خزاں کے پتوں کی مانند سوکھ چکے تھے۔ وہ اپنے نام پر زیرِ لب مسکرا دیا۔ پھر اس کی سوچ نے کروٹ لی وہ سوچنے لگا نہ جانے کیا سوچ کر گھر والوں نے اس کا نام سکندر رکھ دیا۔ ایک وہ سکندر جس نے ساری دنیا پر حکومت کی اور ایک میں کہ دو وقت کے کھانے کو ترس رہا ہوں۔ جس طرح شیر کی کھال پہننے سے گیدڑ شیر نہیں بن جاتا اسی طرح سکندر نام رکھنے سے بھکاری سکندرِ اعظم نہیں بن جاتا لیکن (دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے) دسمبر کا سرد مہینہ اور کڑاکے کی ٹھنڈ......" اس کے جسم پر زیادہ کپڑے بھی نہیں تھے۔ البتہ پیدل چلنے سے اس کے جسم میں خون کی حرارت تیز ہو گئی تھی۔ تھوڑا استانے کے لئے وہ فٹ پاتھ پر لگے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک ریڑے والا چلا رہا تھا، مونگ پھلی...... مونگ پھلی...... گرم گرم مونگ پھلی...... ٹائم پاس مونگ پھلی...... بابو جی! دے دوں کیا؟ اس کی آواز سے سکندر کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نہیں...... سکندر اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اس کا جی ضرور للچایا لیکن جیب خالی تھی۔ دفعتاً سکندر کا دھیان ٹرانسسٹر کی طرف گیا جس پر کرکٹ میچ پر انگیریز میں کمینٹری نشر ہو رہی تھی۔ سکندر نے ایک بھرپور نظر مونگ پھلی والے پر ڈالتے ہوئے بیساختہ پوچھ لیا، بھیا! کچھ سمجھ بھی آتی ہے انگریزی یا پھر یونہی؟ کیوں نہیں سمجھیں گے صاحب! انگلش میں ایم۔ اے کیا ہوں! کیا؟؟؟ سکندر حیران رہ گیا اور سوچنے لگا جس ملک میں ایم۔ اے پڑھا ہوا مونگ پھلی بیچتا ہو۔ وہ ملک

ترقی یافتہ کیوں نہ ہو۔ کیا زمانہ آ گیا ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ مونگ پھلیاں بیچ رہے ہیں۔ ان پڑھ اور جرائم پیشہ افراد اونچے ایوانوں میں بیٹھ کر ان کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ یہ کیسا دستور ہے اس ملک کا۔ یہ کیسی جمہوریت ہے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا...... شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے اندھیرا جلدی پھیل گیا تھا۔ سڑک پر اکا دکا لوگ ہی چل رہے تھے البتہ گاڑیوں کی آمد ورفت میں ضرور اضافہ ہو رہا تھا۔ تمام شہر میں روشنیوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ وہ میونسپلٹی کے کھمبے پر لگے ہوئے بلب کو ٹکٹکی باندھنے گھور رہا تھا اور دن بھر کے کام کا تجزیہ کر رہا تھا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی اداس تھا کیونکہ آج وہ اُمید بھی کچے دھاگے کی مانند ٹوٹ گئی تھی جس پر اُسے بھروسہ تھا اس کے ایک دوست نے اُسے ایک پرائیویٹ اسکول میں بطورِ ٹیچر تعینات کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب وہ دوست سکندر سے ملا تو امید کا وہ چراغ بھی نا امیدی کی پھونک سے بجھ گیا۔ جس کی روشنی سے وہ اپنی زندگی کا اندھیرا دور کرنے کا متمنی تھا۔ کیونکہ اسکول والوں نے بی۔ ایڈ کا تقاضا کیا تھا۔ جو کہ ایک بہانہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں حکومت کو کوس رہا تھا جس نے پڑھے لکھے نوجوانوں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عارضی بنیادوں پر تعینات کر کے ان کا مستقبل مخدوش کر دیا تھا، کچھ دیر کے بعد وہ گھر پہنچا تو ماں اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھی تھی۔ بیٹا کھانا رکھا ہے کھا لے! ماں مجھے بھوک نہیں ہے! وہ رضائی اوڑھ کر سونے لگا تو ماں نے قریب آ کر کہا، بیٹا!

ڈاکیہ یہ لفافہ دے گیا ہے۔ ڈاکئے کا نام سن کر وہ فوراً اُٹھ بیٹھا، سکندر نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بے تابی کے عالم میں اس نے جلدی جلدی لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ایک انٹرویو کال نکلی جسے دیکھ کر وہ اُچھل پڑا۔ پھر نیند اس کی آنکھوں کی وادی سے دور بھاگ گئی اور جسم میں لہو کی روانی تیز ہو گئی۔ ساری رات اس نے کروٹ بدل بدل کر کاٹی، وہ سوچ رہا تھا کب سحر ہو اور وہ انٹرویو کے لئے جائے۔ اس نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ حکومت نے پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کا عہد کیا تھا اور انٹرویوز میں غیر جانبداری اور شفافیت برتی جائے گی۔ لیکن اس کا یہ بھرم بھی دوسرے دن چکنا چور ہو گیا۔ جب وہ چار بورڈ ممبران کے روبرو بیٹھا ان کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا...... بالکل بے ہودہ سوالات۔ مضمون کی مناسبت سے ایک بھی نہیں، جب اس سے رہا نہ گیا تو وہ بول پڑا، ایکسکیوزمی سر! میں یہاں لیبر انسپکٹر کی اسامی کے لئے انٹرویو دینے آیا ہوں چپڑاسی کی نہیں...... ! کیا مطلب؟ ایک آفیسر نے اپنی عینک میز پر رکھتے ہوئے پوچھا، یہی کہ آپ مجھ سے عجیب قسم کے سوال کر رہے ہیں، کیلا کتنے انچ لمبا ہوتا ہے؟ کرسی کتنے فٹ اونچی ہوتی ہے؟ تم یہاں انٹرویو دینے آئے ہو کہ بحث کرنے؟ تمہارے پاس کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے اور ہمیں ہمارا کام سمجھا رہے ہو۔ دوسرے آفیسر نے بات کاٹتے ہوئے کہا...... یو۔ کین۔ گو...... ! لیکن سر! میں نے کہا نا تم جا سکتے ہو......!!! چلو نیکسٹ...... ! وہ اپنی اسناد اٹھا کر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے

باہر نکل گیا۔ بوڑھا چپڑاسی جو یہ سارا تماشہ خامشی سے دیکھ رہا تھا سکندر کے پاس آکر بولا، بیٹھا یہ سب تو فارملٹی ہے! جن لوگوں کو نوکری لگنا ہے ان کی فہرست تو پہلے سے تیار ہوگی...... لیکن بابا میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟ بالکل نہیں بیٹا......! یہ لو پانی پی لو! چپڑاسی نے گلاس آگے بڑھایا......، سکندر نے پانی حلق میں اُتارا تو اسے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اس کی حالت پر چپڑاسی کو رحم آیا اور بولا، بیٹا آج کے دور میں رشوت یا سیاسی اثر رسوخ کے بغیر نوکری کا تصور بھی نہ ممکن ہے! سکندر بھی جذباتی انداز میں مخاطب ہوا، بابا۔! جب حق داروں کو اس کا حق نہیں ملتا تو وہ احتجاج سڑکوں پر اُتر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم پیشہ افراد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہی لوگ سیدھے سادھے نوجوانوں کو غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور پھر دہشت گردی جیسی مہلک بیماری جنم لیتی ہے۔ کہتے ہوئے اس کا گلا رُندگیا، آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب لئے وہ دفتر سے نکل آیا۔ سیڑھی کے زینے اُترتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ وہ تمام اسناد پھاڑ کر پھینک دے۔ ان ڈگریوں کا بھلا کیا فائدہ جو ایک انسان کو دو وقت کا کھانا نہ دے سکیں؟ اس کے دماغ میں ہزاروں طرح کے سوالات سر اُٹھا رہے تھے۔ وہ خیالات کے سمندر میں غوطے کھانے لگا، رشوت کے اِس کالے بازار میں ڈگریوں کو ردی کے بھاؤ بیچا اور خریدا جاتا ہے۔ یہاں قابلیت کی کوئی قدر نہیں...... جو سرکاری نوکری کی جتنی بڑھ کر بولی لگائے گا وہی اس کا حق دار ہوگا۔ رشوت یا سفارش کی بنیاد پر ہی اگر نوکریاں بٹ رہی ہیں تو پھر تعلیم

کی کیا اہمیت ہے۔ جو لوگ ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں وہ کہاں جائیں انہیں سوچوں میں گم وہ ایک سنسان جگہ پر رک گیا۔ اسے رہ رہ کر اپنی ماں کا خیال آرہا تھا جو گذشتہ کئی روز سے کافی علیل تھی۔ اس کے خون میں شکر کی مقدار بڑھ گئی تھی۔ وہ حقیقت سے آنکھیں موند لیتا تو آنکھوں کے سامنے اس بنیے کا بدھا چہرہ گھوم جاتا جس کا کئی ماہ کے سودا سلف کا قرض چڑھا ہوا تھا تو کبھی مالک مکان کی گرجدار آواز کانوں میں بازگشت کرنے لگتی، اگر ایک ہفتہ کے اندر اندر چھ ماہ کا کرایہ ادا نہ کیا تو گھر کا سارا سامان باہر پھینک دوں گا۔ سرائے سمجھ رکھا ہے! وہ سوچنے لگا، آج کون سا بہانہ بنائے گا۔ پریشانی کے عالم میں چلتا ہوا وہ گھر کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ دور تک خاموشی کا راج تھا۔ سکندر عجیب سا خوف محسوس کر رہا تھا۔ درد کے مارے اس کا سر بھی پھٹا جا رہا تھا۔ اپنے گھر کے آنگن میں لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا جونہی ان کی نظر عورتوں کے درمیان سفید کپڑے میں لپٹی اپنی ماں پر پڑی تو اس کا سر چکرانے لگا پھر وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا......، اب وہ تھا اور تنہائی۔ ہال نما کمرہ اسے کاٹنے کو آتا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بہر حال زندگی تو گزارنی ہی تھی۔ اب وہ ایک کمپیوٹر سنٹر میں کام کرنے لگا تھا۔ ساتھ ہی نوکری کے پیچھے بھی بھاگتا رہا۔ دریں اثنا اس کی عمر کی حد بھی ختم ہونے کو آن پہنچی۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوا اٹھا۔ اب صرف ایک فہرست منظرِ عام پر آنا باقی تھی۔ جہاں ایک سال قبل اس نے انٹرویو دے رکھا تھا۔ اب

کی بار اسے پورا یقین تھا کہ منتخب امیدواروں میں اس کا نام ضرور ہوگا۔ اُسے اس فہرست کا بے صبری سے انتظار تھا......، زمین اپنے محور پر گھومتی رہی دن مہینوں میں ڈھل گئے۔ موسم نے بھی کروٹ بدلی۔ شجر پتوں کے لباس سے محروم ہو گئے۔ خزاں نے سارے عالم کو اپنی آغوش میں لے لیا......، پڑوسی کے مرغے نے صبح کا اعلان کیا تو سکندر کی آنکھ کھلی۔ آفتاب کی کرنیں کھڑکی کی جھریوں سے چھن کر کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ سکندر نے بستر میں لیٹے لیٹے ہی ایک بھر پور انگڑائی لی......، گلی میں کافی چہل پہل تھی۔ ننّھے ننّھے بچّے بھاری بستے اٹھائے اسکولوں کی طرف رواں دواں تھے۔ وہ بھی کام پر چل پڑا۔ بازار میں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ آج کے اخبار میں منتخب امیدواروں کی فہرست شائع ہوئی ہے۔ اس نے فوراً ایک اخبار اٹھا کر ورق پلٹا۔ اگلے ہی لمحے اس کی انگلی فہرست میں چھپے ناموں پر دوڑنے لگی دیکھتے ہی دیکھتے فہرست ختم ہوگئی پر اُس کا نام کہیں نہ تھا اس کے دل کو شدید دھچکا لگا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں وہ وہیں سے واپس گھر لوٹ آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی اسناد اور اخبار میز پر رکھ دیئے اور خود چار پائی پر ڈھیر ہو گیا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اندھیرا اپھیل چکا تھا۔ اس کا سر اور بدن بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ کپکپاہٹ سے پوری چار پائی ہل رہی تھی۔ اس کے سر پر سوچوں کے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ آج تو وہ ملازمت کے لئے مقرر کردہ عمر کی حد بھی پار کر چکا تھا۔ دفعتاً اس کی آنکھوں کے سامنے اس مونگ پھلی والے کا

چہرہ رقص کرنے لگا، نہیں......ایک دبی دبی چیخ کمرے میں گونج گئی۔ پھر اس نے بمشکل ہاتھ بڑھا کر موم بتی کا ایک ٹکڑا روشن کر دیا۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ وہ جلتی ہوئی موم بتی کو ایک ٹک دیکھتا رہا اور سوچنے لگا، اس کی زندگی بھی تو اسی شمع کی مانند پگھل گئی اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ اس سے بہتر تو یہ شمع ہے جو اوروں کو اپنی روشنی سے فیضیاب کرتی ہے۔ اُسے تو زندگی نے کچھ بانٹنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ فکر، غم، خواہش، حسرت، ارمان اور سوچوں کے بوجھ تلے وہ دبتا چلا گیا۔ شمع کا وجود ختم ہونے کو تھا۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ گردن اٹھا کر پھونک مار سکے۔ لیکن اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ اوپر اٹھ سکتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شمع نے اپنی لَو کا دائرہ وسیع کر دیا اور پھر آہستہ آہستہ میز پر رکھی ہوئی اسناد اور اخبار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا سکندر اپنے بستر پر بے سد پڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

............☆☆☆............

اپنے طویل تخلیقی سفر میں پرویز مانوس کا صرف دوسرا افسانوی مجموعہ منظرِ عام آنا اِس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انہوں نے اگرچہ کم افسانے لکھے مگر اچھے اور معیاری لکھے۔ شاید ایسے ہی ادب کی آج کے قاری کو تلاش ہے۔ اُن کے افسانوں کی خاصیت یہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے قاری ان میں کھو جاتا ہے اور جب باہر نکلتا ہے تو ایک طرح کے کرب کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی محسوس کرتا ہے۔ بعد از مطالعہ اِس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں کہانی پن کا عُنصر وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے جو افسانے کو دوام بخشتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے تخلیقی افسانے کا پلاٹ اور موضوع اردِ گرد کے ماحول اور روز مرّہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات سے لیا ہوتا ہے۔

اِن کے افسانوں میں محنت کی مہک، ہوس کی بھوک، حقیقت پسندی، جبرو استحصال، عدالتوں میں بِکتا انصاف، اخلاقی قدروں کا فُقدان، معاشرے میں بڑھ رہی بے راہ روی، اولڈ ایج ہومز کا کرب، جنسی استحصال کا خوف، معاشی اُلجھنیں، سماجی بے قدری کا احساس، دیہاتوں سے شہروں کی جانب ہجرت کا بڑھتا رُجحان، زرعی اراضی پر کنکریٹ عمارتوں کے پھیلتے جال کا عکس صاف جھلکتا ہے مختصر یہ کہ ''مُٹھی بھر چھاؤں'' میں شامل سارے افسانے دورِ حاضر کی ترجمانی کرتے ہیں یقیناً اُن کی یہ کاوش اُن کو اِس راہ پر اوج عطا کرے گی۔

آفاق ملہوترہ
برمنگم برطانیہ

دیگر تصانیف

(۱)	بیتے لمحوں کی سوغاتیں	شعری مجموعہ
(۲)	شکارے کی موت	افسانوی مجموعہ
(۳)	موسم اُڑان کا	شعری مجموعہ
(۴)	چڑ ہیٹھاں	افسانوی مجموعہ
(۵)	اگ نے پھمبڑ	شعری مجموعہ
(۶)	چاند، لمس، گلاب	شعری مجموعہ
(۷)	اوج خیال	مرتب شاعری
(۸)	فریاد	پہاڑی ناول
(۹)	چن ماما	بچوں کی کہانیاں
(۱۰)	سانجھا درد	کشمیری افسانوں کا ترجمہ
(۱۱)	سانجھی سوچ	کشمیری افسانوں کا ترجمہ
(۱۲)	پانی بچ پھمبڑ	کشمیری ناول کا ترجمہ
(۱۳)	بیداری	اسٹیج ڈرامہ
(۱۴)	فیصل شہر سے	شعری مجموعہ زیر طبع
(۱۵)	اَگ نے پر	ترجمہ Wings of Fire

اعزازات

(۱) لٹریری ایوارڈ ۲۰۰۴ء، سٹوڈنٹ کلچر کونسل جموں یونیورسٹی

(۲) ادبی کنج لٹریری ایوارڈ ۲۰۰۵ء، ادبی کنج لٹریری سوسائٹی جموں

(۳) لالہ جگہ نارائن ادبی ایوارڈ ۲۰۰۶ء، لوک لکھاری سبھا جالندھر

(۴) بیسٹ بک ایوارڈ ۲۰۰۶ء، ریاستی کلچرل اکیڈیمی

(۵) لٹریری ایوارڈ ۲۰۰۸ء، انجمن ترقی اُردو ہند (کشتواڑ شاخ)

(۶) بیسٹ ٹرانسلیشن ایوارڈ ۲۰۱۲ء ریاستی کلچرل اکیڈیمی